چندرا موہنی
انصار ناصری دہلوی

(ناولٹ)

از

انصار ناصری

بی۔ اے ایل ایل۔ بی

زمانہ جنگ کا اڈیشن

(مطبوعہ جمال پریس دہلی)

قیمت - ایک روپیہ۔ آٹھ آنے

دوسرا اڈیشن

1/50

پیشکش

بھائی شاہد احمد دہلوی

بی۔اے (آنرز)

ایڈیٹر رسالہ ساقی دہلی

کی خدمت میں

ایک محقّر ہدیۂ خلوص

انصار ناصری

فہرست ابواب

تعارف

انسانی زندگی کی دو قسمیں ہیں — حیاتِ اجتماعی اور حیاتِ انفرادی۔ اوّل الذکر کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مخصوص قوم کا نظامِ حکومت، طرزِ معاشرت، عقائدِ مذہب، جذبۂ حُب الوطنی اور طریقِ تجارت وغیرہ کیا ہیں۔ لیکن یہ وہ لوازمِ تمدن ہیں جن سے کسی قوم کے افراد کی صحیح ذہنیت کا پتہ نہیں چل سکتا۔ کیونکہ حیاتِ اجتماع میں انسان اپنی انفرادی شخصیت کو کھو دیتا ہے، اور ہر وہ کام کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے جس کی تحریک جماعت کی طرف سے ہو۔ برخلاف اس کے موخر الذکر کا مطالعہ کرنے سے اُن احساسات و مشاعر، خیالات و تصورات اور عواطف و جذبات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جو علیحدہ علیحدہ ہر شخص کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں اور چونکہ ان کیفیاتِ نفسانیہ کے ذریعے ادبیات کی تشکیل ہوتی ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ

کسی قوم کے افراد کی صحیح ذہنیت سمجھنے کے لئے سب سے پہلے اس کے لٹریچر کا مطالعہ ضروری ہے۔ لہذا ہر شخص کا فرض ہونا چاہیئے کہ اپنے ملک کے ادبیات کو ہر قسم کے رطب ویابس سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے اور صرف انہیں جواہرِ ادبی کو قائم رکھا جائے جو مفادِ ملّی کے لائق ہیں۔

انصار صاحب بھی انہیں نوجوانوں میں سے ہیں جو علم وادب کی صحیح خدمت کرنا اپنا فرض تصور کرتے ہیں۔ موصوف کی شخصیت مزید تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ عرصہ دراز سے میکشانِ ادب میں ان کو طرۂ امتیاز حاصل ہے۔ اور خاص طور پر جب سے "سلمیٰ" شائع ہو کر مقبولِ عوام ہوئی ہے ان کی شہرت کو اور بھی چار چاند لگ گئے ہیں۔

اس وقت ان کی تازہ ترین تصنیف "چندرا موہنی" پیشِ نظر ہے جو مستقبل قریب میں آسمانِ ادب پر ایک درخشندہ ستارے کی طرح چمکنے والی ہے۔

اچھے افسانے کے لئے صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ رفعتِ تخیل اور ندرتِ بیان ـــــ اور یہ دونوں صفات بمنزلہ روح اور جسم کے ہیں، اگر ان میں سے ایک کا بھی فقدان ہو گا تو دوسری

پامال ہوجائے گی۔ "چندرا موہنی" کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ دونوں خصوصیات اس میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ تھیکرے کے ناولوں کی طرح پیش نظر افسانے کے تمام کردار جلیل القدر اور ممتاز حیثیت کے افراد ہیں۔ چندرا موہنی جس کے نام پر کتاب کا عنوان قائم کیا گیا ہے ایک ہندوستانی ریاست کی کماری ہے۔ خود ہیرو ایک ذی مرتبہ خاندان کا رُکن اور اعلیٰ دل و دماغ کا مالک ہے۔ یہ مُصنّف کی علو خیالی کا ثبوت ہے۔ تاہم اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ کم درجے کے لوگوں میں عشق و محبت کے جراثیم نہیں پائے جاتے۔ دوسری بات قابل ذکر یہ ہے کہ یہ افسانہ بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے اور اسی لئے اس کا پلاٹ بہت زیادہ دلچسپ ہوگیا۔

عام طور پر ناول نویس جذبۂ محبت کو ایسی صورت میں پیش کرتے ہیں گویا وہ ایک مُہلک مرض ہے جس کا اثر پہلے ہی جلوہ میں ہوجاتا ہے۔ حالانکہ یہ چیز مُشاہدہ کے خلاف ہے۔ عملی زندگی میں ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ قابل مُصنّف نے اس نظریہ کی تردید کرتے ہوئے محبت کی تدریجی نشوونما نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کی ہے۔ پہلی مُلاقات میں طبیعت کا رجحان ایک جنس

کی طرف سے دوسری صنف کی طرف ہوتا ہے۔ پھر کسی قدر تُرشیت
پیدا ہوتی ہے جس کے بعد ایک نامعلوم خلش کا احساس ہوتا
ہے۔ پھر دل میں ایک قسم کی چٹک شروع ہو جاتی ہے، ہر وقت
صرف ایک ہی ہستی تصورات کا مرکز بنی رہتی ہے۔ اس کے بعد
یہ ہوتا ہے کہ ایک خود فراموشی محویت میں تبدیل ہو جاتی ہے جس
کا نام محبت ہے ـــــ "چندرا موہنی" میں اس تدریجی ترقی کو
ایسے دلآویز پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ بالکل غیرارادی طور پر
تعریف کرنی پڑتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ادب لطیف
کے دلفریب ٹکڑوں نے حسن بیان کو اور بھی معراج کمال پر
پہونچا دیا ہے۔ کہیں کہیں عبارت میں انگریزیت کی جھلک نمودار
ہوتی ہے مگر پھر بھی غیر مانوس یا ناخوشگوار ہونے نہیں پاتی۔
دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ اس میں ایک انوکھا پن
ضرور ہے مگر اجنبیت سے مبرا ہے۔

پلاٹ میں دوسری بات قابل ذکر یہ ہے کہ تسلیم ـ امیرِ فتانہ
ـــــ چندرا موہنی کے جمال ظاہری پر مائل نہیں ہوتا۔ حسن
بے بنیاد اور سریع الزوال ہوتا ہے ـــــ بلکہ جو چیز اس کے دل
کو موہ لیتی ہے، وہ چندرا کا بے لوث جذبۂ ہمدردی، خلوص دلی

اور غیر معمولی ذہانت ہے۔ وہ بغیر کسی غرض کے سلیم کی تیمارداری
محض اس لئے کرتی ہے کہ وہ اُس کا ہم وطن ہے ۔۔۔ وہ نرس
کی حیثیت سے ۔۔۔ جیسا کہ تصویر سے بھی ظاہر ہے ۔۔۔ مسیحا بن کر
آتی ہے۔ سلیم کے جسم کو تندرست کرتی ہے، مگر رفتہ رفتہ غیر ارادی
طور پر اُس کی روح کو سودائے محبت میں مبتلا کر دیتی ہے اور خود
اس کی روح کو بھی وہی مرض لاعلاج لاحق ہو جاتا ہے۔
ورق گردانی کر کے انجام پر نگاہ ڈالئے چندرا کا کردار
کس قدر فطری ہے۔ محبوب کو بے وفا ظالم اور سفاک کہا جاتا ہے۔
مگر یہ نظریئے صرف دنیائے شعریت کے لئے مخصوص ہیں۔ عملی
زندگی میں ان کی تغلیط ہو جاتی ہے۔ مجبوراً تسلیم کرنا پڑتا ہے
کہ صنف نازک کی ہستی مہر و وفا کی مجسم تصویر ہے اور قدرت
نے سب سے زیادہ پُر خلوص، سب سے زیادہ نرم اور سب سے زیادہ محبت
بھرا دل صرف عورت ہی کے لئے تخلیق کیا ہے۔ بلا شبہ وہ پریم
آکاش کی دیوی ہے ۔ چندرا اپنی جان پر کھیل کر قسطنطنیہ
کی زہریلی فضا میں چلی جاتی ہے۔ محض اس لئے کہ سلیم کو وہاں
جانے سے باز رکھ سکے۔ وہ خود اجل کے آغوش میں پہونچ جاتی
ہے۔ مگر اپنی زندگی کو قربان کر کے اس عزیز از جان ہستی کو موت

کے منہ سے بچا لیتی ہے جس کی خاطر اس نے اپنے وطن عزیز، خویش و اقربا، دولت و ثروت اور ہر قسم کے تعیش سے منہ موڑ لیا تھا۔

چندرا کی موہنی مورت خاک میں مل چکی۔ اور اس کی یہ داستانِ خونچکاں افسانۂ فردا معلوم ہونے لگی ہے مگر اس کے حسن کی کرشمہ سازی اور محبت کی ہلاکت پسندی اس وقت تک صفحۂ ہستی پر قائم رہے گی جب تک کہ اس دنیائے آب و گل میں صنفِ نازک کا وجود باقی ہے۔

۵ جنوری ۱۹۳۳ء

دہلی

فضل حق قریشی دہلوی

پہلا باب

دیباچۂ دل

ایک سرد کہر سے گھری شام کو ــــ جو لندن کی فضا کی ایک نمایاں خصوصیت ہے ــــ میرے تمام ہندوستانی اور ولایتی "یارانِ دلفگار" میرے کمرے میں موجود تھے جن میں سے ولسن، براؤن، یعقوب اور ہنری کی موجودگی میرے لئے خاص طور سے تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی۔ اپنے طبعی رحجان اور اس پر مستزاد اپنے تلخ تجربے کی بنا پر میں اس کُلیہ کو اپنا ایمان سمجھنے لگا ہوں کہ اس "عالمِ ناپائیدار" میں "دوست" کا وجود عنقا سے کم نہیں۔ میرا صرف ایک دوست ہے جس کو میں جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ اور جس کی دوستی حاصل کرنے میں میں نے ہر قسم کی صعوبتیں اٹھائیں! وہ دوست "علم" ہے اور دوسرا عزیز "خود میں" یعنی الیغورِ اعظم (Ego, the Great)۔ ان دونوں کے علاوہ تمام انسانی انسیت و محبت کے قابلِ قدر جذبات کو میں قطعی طور سے لایعنی

سمجھتا ہوں۔

ایک طویل خاموشی کے بعد روبنسن نے کہا "سلیم! اگر تم نے اپنی صحت کا خاطر خواہ خیال نہ رکھا تو تمہیں ہمیشہ کیلئے پچھتانا پڑیگا"

ہنری بولا۔ "آخر مرض کیا ہے ؟"

یعقوب نے ٹانگیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ "ٹی بی!"

"چپ!" میں نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے کہا "میرے پھیپھڑے کمزور ہو گئے ہیں اور بس"

برآؤن سگار کا دھواں اڑاتے ہوئے نصیحت آمیز لہجہ میں بولے "عزیزمن! تمہیں اپنے جسم کا ضرور خیال رکھنا چاہیئے اپنے دماغ کو اتنا زیادہ نہ تھکاؤ کہ وہ تمہارے جسم کو کھانے لگے۔"

"لیکن بھئی وہ نوکر کس کام کا جو کسی مرض کی دوا نہ ہو جسم تو بحیثیت نوکر کے ہے" میں نے کہا۔

ہنری صاحب کی نہ معلوم کونسی رگ پھڑکی کہ آپ بغیر کسی نوٹس کے اپنے فرسودہ مذاق پر اتر آئے یعنی جرمنی اردو میں گانے لگے۔

"ہم چپکے چپکے روتا اے۔ گم مال ٹیڑے یاڑ" میرے علاوہ سب نے اس "دعوتِ قہقہہ" کو قبول کیا اور فی الفور میرا کمرہ گدھوں اور گھوڑوں کی سی آوازوں سے بھر گیا۔ میرا جسم مریض تھا اور میری

روح مضمحل، ان کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرکت نے میری بے چینی کو دوبالا کر دیا۔ ناچار انگڑائی لیتے ہوئے اٹھا۔ شکر خدا کا میری اس حرکت سے حسبِ دلخواہ نتیجہ برآمد ہوا اور وہ سب کے سب رخصت ہوئے اور میں نے اُن سے خلاصی پا کر ایک قلبی مسرت محسوس کی۔ میں آتشدان کے قریب آیا اور تابدان سے سہارا لیکر کھڑا ہو گیا۔ میں بیمار تھا، میرے امتحان میں صرف چھ مہینے باقی تھے اور ایسی حالت میں میری بیماری ایک حد تک منحوس ثابت ہو رہی تھی۔ اپنی تمامتر کوششوں کے باوجود میں "العود اعظم" بیمار ہو ہی گیا۔ میرا جسم مریض تھا مگر اُس کے مریض ہونے سے چنداں نقصان نہ تھا جتنا اس کی "ناقابلیت" سے۔ میں اپنے جسم کے ساتھ اُسی طرح پیش آتا تھا جس طرح ایک مکار اور سخت گیر آقا اپنے مظلوم اور بیکس غلام کے ساتھ پیش آتا ہے۔ کاش! میری روح میرے جسم کی جابرانہ جکڑبندیوں سے آزاد ہوتی۔ حالانکہ جسم روح کے مقابلہ میں ایک ادنیٰ غلام سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور روح کو جسم پر کما حقہ حکومت بھی حاصل ہے لیکن ان سب کے باوجود روح کم از کم قیامت تک تو ضرور اپنے ادنیٰ غلام کے ساتھ وابستہ رہے گی۔ اُف کتنا اٹل اور قطعی فیصلہ

ہے!

پلیٹو (Plato) کی تمام سوفسطائی (Sophistic) درسیات کے باوجود میں نے اس چیز کو ہمیشہ اپنا اُصول بنائے رکھا کہ جسم کی تمامتر قوتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اور ایمان کی بات ہے وہ خوب اچھی طرح اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ حدیہ کہ بے پایاں مشقتیں اُٹھاتے اُٹھاتے اُس کی ہڈی سے چمڑا الگ گیا۔ اور "دماغ" اُس کو اپنی فتحمند گاڑی میں جوتے ہوئے قدم قدم پر دُرّے اُڑاتا ہوا سنگلاخ راستوں سے برابر گذرتا رہا۔ لیکن ایک دن آخر وہ بیدم ہو کر گر پڑا۔ "دماغ" سوائے اس کے اور کیا کر سکتا تھا کہ اپنے تیجے میں آپ سُلگتا رہے۔

میں نے ایک ڈاکٹر سے بھی مشورہ لیا اور میری توقع کے مطابق اُس نے وہی مرض تجویز کیا اور یہ بھی کہا کہ "تم کو دماغی کام مطلق نہ کرنا چاہیئے! تمہارے اعصاب اتنے کمزور ہو گئے ہیں کہ عنقریب اُن میں سے زندگی کی لہر قطعی طور سے مفقود ہونے والی ہے!" یہ الفاظ اب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں، کیا میں اُس کا کہا مان لوں؟ ــــ یا اپنے نحیف جسم کو بغیر "کالبد کا احساس کئے" ایک لامحدود حد تک استعمال کرتا رہا ہوں۔

وہ شدید ترین بیماری اور سخت سے سخت تکلیف میں بھی کام کرنے کا
عادی ہو چکا ہے۔ کیا میری بہترین نظمیں سخت قسم کے دردِ سر
میں نہیں لکھی گئیں ـــــ ؟ ہاں تو اب بھی اس تکلیف میں اگر کام
کیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ ولسن کے الفاظ مجھے یاد آئے "اگر جسم
نہ ہو تو تمہاری ساری قابلیتیں بیکار ہیں۔"

خوف کی ایک خفیف سی لہر میرے جسم میں دوڑ گئی اور کانپتے
ہوئے میں ایک کرسی پر گر پڑا۔ میرے کمزور ہاتھ ناتوانی کے پسینہ
میں تر تھے۔ "یقیناً!" میں نے کہا۔ "بھاڑ میں جاتے کام۔ میں پھر
اس کی تلافی کروں گا۔ فی الحال مجھے جلدی تندرست ہو جانا
چاہیے۔" میری متخیلہ میری دیرینہ علالت کی وجہ سے قنوطیت
کی طرف اس درجہ مائل ہو گئی تھی کہ ہر لمحہ میرے دل میں ناکامیابی
شکست اور شاید موت کے خیالات آتے رہتے تھے۔ ایک نامعلوم
بلا وجہ مگر شدید قسم کا خوف میرے اوپر طاری تھا۔ کاش میں
آزاد ہوتا۔ لیکن خود اپنے وجود سے کسی کو آزادی ملنی ناممکن ہے!
میں آئی۔ سی۔ ایس کا قابل ترین اُمیدوار اپنے پرنسپل اور اپنے
ٹیوٹر کی آنکھ کا تارا، اپنے کالج کے لئے باعث فخر اور آج
صرف علالت کی وجہ سے شکست کھاؤں ؟ ناممکن!

میں رشک و حسد کا مرکز بنا ہوا تھا۔ میرے ہم جماعت میری قابلیت پر عش عش کرتے تھے۔ اُن سب کو تعجب ہوتا تھا کہ میرے چھوٹے سے سر میں لاطینی و یونانی کے بیش بہا خزانے آخر کس طرح جمع ہوگئے تھے۔ وہ میری علمی مفروضات کو حیرت سے دیکھتے تھے، لیکن انہوں نے شاید کبھی اس بات پر غور نہیں کیا یہ تمام مفروضات اور قابلیتیں صحیح معنوں میں خونِ جگر پینے سے حاصل ہوتی ہیں۔ میں نے تلاشِ علم میں ہر قسم کے خیش و آرام کو قطعی طور سے ٹھکرا دیا۔ ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں راتیں پلیٹو کو سمجھنے کے لئے صرف کردیں، گھنٹوں نہیں بلکہ پہروں شدید درد میں فلسفہ کی کتھیوں میں اُلجھا رہا۔ اور اب لوگ مجھ سے حسد کرتے ہیں اُن کے دل میری طرف سے بے جا بغض و کینہ سے معمور ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ میرے دن دوزخ کا نمونہ ہیں اور میری راتیں احساسِ شکستگی میں صرف ہوتی ہیں ـــــ جب ایک وسیع تجربہ اور ذوق الفطرت دماغ مکمل خود غرضی کے احساس سے مل جاتا ہے تو ایک منظم دوزخ نتیجہ کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ اس پر مستزاد علالت، درد و کرب کی بے چین اور طویل راتیں "مینیا" اور بالآخر "خودکشی" کی جرأت پیدا کر دیتی ہیں۔!

لوگ مجھ سے حسد کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں مجسم فتحمندی اور کامیابی ہوں۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ فطرت نے مجھ پر اپنے بیش بہا تحائف نثار کردئے، یہ ایک حد تک درست ہے۔ فطرت کی طرف سے مجھے کسی قسم کی شکایت نہیں۔ لیکن میں نے فطرت کے تحائف کو کس طرح استعمال کیا ہے وہ دیا تین سال پہلے میں جمناسٹک کا ماہر تھا، بہترین غواص، فٹ بال اور ہاکی کا بہترین کھیلنے والا اور پھر کس طرح میرا دماغ، خاموشی کے ساتھ لیکن تیزی سے بڑھتا گیا اور مجھ سے بیش از بیش توجہ طلب کرتا گیا۔ ابتدا میں کھیل اور تفریح کی طرف توجہ کم ہوتی گئی اور پھر کھانے کا خیال کم ہوتا گیا۔ اور پھر سونے کا اور بعد ازاں یہ حالت ہوگئی کہ میرے لئے دن اور رات ہم معنی چیزیں ہوگئیں۔ جب دن کی روشنی کم ہوجاتی تو برقی قمقمے اس کی جگہ لے لیتے اور آخر کار جب میری سوجی ہوئی آنکھیں حروف کو شناخت نہ کرسکتیں تو میں مجبور ہو کر اپنے بستر پر دراز ہوجاتا۔ بلکہ اکثر تو کرسی ہی پر سو جاتا یا بیہوش ہوجاتا۔ کھانا پینا اور اس قسم کے تمام فعل محبت غیر ارادی طور پر سرزد ہوتے تھے میں کسی کام کو اپنی تمام تر قوت اور توجہ سے نہ کرتا تھا سوائے اک ایک کے جو میرے رگ و ریشہ میں پیوست ہے۔ تلاش اور طلب علم!!!

دوسرا باب

احساس

خیالات کی رو میں خدا معلوم میں کب تک غرق رہا اور کب زیادہ درد محسوس کر کے اپنے بستر پر دراز ہوا اور کب تکان سے مغلوب ہو کر سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو کمرے میں روشنی تھی اور کواڑ کی درزوں میں سے چمکدار دھوپ کی شعاعیں چھن چھن کر آ رہی تھیں، آتشدان میں آگ روشن تھی۔ میز پر پوشش پڑی ہوئی تھی اور اس پر میرا ناشتہ چنا ہوا تھا۔ ایک کرسی میرے بستر کے قریب پڑی ہوئی تھی اور میری دوا کی شیشی، چمچہ، گلاس اور پانی کا جگ اُس پر رکھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹی سی طلائی گھڑی بھی رکھی ہوئی تھی۔ شاید اس مقصد سے کہ میں وقت دیکھ کر یہ معلوم کر لوں کہ خوراک پینے کا وقت گذر چکا۔ میں نے دوا کی شیشی میں سے ایک خوراک نکالی اور پی لی، ساتھ ہی ساتھ میرے دل میں ایک مُبہم سا حیرت آمیز خیال آیا کہ میرے کمرے میں کون آیا — اور یہ تمام اہتمام کس نے

کیا۔ میں نے اُس گھڑی کو احتیاط سے اُٹھا کر جیب میں رکھا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

شاید ڈاکٹر یہ خیال کر کے کہ اس مسافری اور بیماری کی حالت میں میرا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہے، ازراہِ ترحم میری خبرگیری کے لئے چلا آیا ہو، لیکن نہیں یہ گھڑی اس کی نہیں ہے اُس کی تو بہت موٹی اور بھدی سی گھڑی ہے۔ میں نے آہستگی سے کافی بنائی اور اپنے تمام دوستوں کی گھڑیوں کا اپنی یادداشت کے مطابق اس خوشنما طلائی رسٹ واچ سے مقابلہ کیا، لیکن مجھے یاد نہیں کہ اُن میں سے کسی کی بھی گھڑی ایسی تھی ـــــ مجھے یہ دیکھ کر اور بھی زیادہ تعجب ہوا کہ میری میز پر جو کتابوں اور کاغذوں کا ایک بے ترتیب انبار لگا ہوا تھا وہ اب نہیں ہے بلکہ تمام کتابیں قرینے سے لگی ہوئی ہیں۔ پلیٹو کی کتابیں خاص طور سے نمایاں جگہ پر رکھی ہوئی ہیں ـــ ابھی میں نے ناشتہ ختم نہ کیا تھا کہ میرے کمرے کا دروازہ کھُلا، میں نے مُڑ کر دیکھا، ایک دراز قد مگر متناسب الاعضاء لڑکی وحشت انگیز انگریزی نرس کے لباس میں کھڑی تھی۔ لیکن اس کا خوبصورت گول سر سیاہ مخملی بالوں سے لدا ہوا تھا اور اس کا قدرے ملاحت لئے ہوئے صندلی چہرہ ـــــ

خالصتاً ایشیائی نژاد ــــ اپنے اندر اس قدر جاذبیت رکھتا تھا کہ میں دیر تک اُس کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔ اُس کی شفاف پیشانی اور اس کے عین وسط میں ایک عمودی رگ غیر معمولی ذہانت کا پتہ دیتی تھی۔ سیاہ اور روشن بڑی بڑی غلافی آنکھیں جن میں نرمی اور محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی میری طرف میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ پتلی ستواں اور مشرقی معیار کے مطابق کتابی سی ناک، باریک اور مختصر گلابی ہونٹ ابھری ہوئی ٹھوڑی، پتلی مگر لانبی گردن، غرض اس کے جسم کا ایک ایک حصہ اور چہرے کا ہر خدوخال اس ملائمت اور اس وقار کا مظہر تھا جو ایشیائی حُسن کی نمایاں خصوصیت ہے۔

میں متوحشانہ انداز میں اُس کے استقبال کو آگے بڑھا اور ایک آرام کرسی اپنی کرسی کے قریب کھینچی۔ نہایت اطمینان سے وہ اُس کرسی پر بیٹھ گئی اور ایک شگفتہ تبسم کے ساتھ گویا ہوئی:۔

"اب آپ کی کیسی طبیعت ہے؟"

"کیا یہ جناب کی مقبوضہ ہے؟" بالکل غیر ارادی طور سے میں نے گھڑی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ایک نقرئی مگر خفیف سے قہقہے نے مجھے مبہوت سا کر دیا۔

"یقیناً جناب! ـــــ مجھے اُمید ہے کہ آپ میری اس بیباکانہ دخل اندازی کو اور اس مداخلت بے جا کو جب کہ آپ محوِ خواب تھے معاف فرمائیں گے:" میں مجسّم استعجاب بنا کھڑا تھا اور دلچسپی کے ساتھ "ہندوستانی" ہاتھوں کو گھڑی باندھتے ہوئے دیکھ رہا تھا ـــــ "میں نے علی الصبح لڑکوں کو آپ کے متعلق باتیں کرتے سُنا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ آپ ہندوستانی ہیں اور میرے ہم وطن ہیں اور اس طرح کس مپرسی کی حالت میں سخت طور پر علیل ہیں تو میری حمیّت نے یہ گوارا نہ کیا کہ میں آپ کو اس طرح مبتلا رہنے دوں۔ اس لئے میں نے جناب کے خانگی معاملات میں دست اندازی کی جرأت کی اور یہاں آکر آپ کو محوِ خواب پایا اور اُن تمام امور کا انتظام کیا جن کی آپ کو سب سے پہلے ضرورت محسوس ہوتی۔ اب میں آپ کے ڈاکٹر کے پاس سے آرہی ہوں"

"کیا واقعی.....؟ آپ نے مجھ پر بڑا کرم کیا" میں نے لڑکھڑاتے ہوئے لہجہ میں کہا۔ اس نے میری اس پریشانی کو شاید محسوس کیا اور باقی الفاظ اس نے سر جھکائے ہوئے شرمیلے انداز میں کہے:۔ "آپ کے ڈاکٹر سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ سخت علیل ہیں اور آپ کی نگہداشت کرنے والا کوئی نہیں۔ اسی بنا پر میں نے آج مداخلت

کی اور اب اگر جناب اجازت دیں تو میں ہر طرح آپ کی خدمت کے لئے تیار رہوں۔"

"لیکن آخر کیوں ـــــ ؟ میں تو بالکل اجنبی ہوں۔ آپ آخر کیوں ایک اجنبی کے لئے اتنی تکلیف گوارا کریں۔" میں نے اُسی وحشت و حیرت آمیز لہجہ میں کہا۔

اُس نے اپنا سر بلند کیا اور کُرسی کی پشت سے سہارا لیا۔ اُس کے بُشرے سے انتہائی ہمدردی برس رہی تھی۔ ایک خفیف سے تبسّم کے ساتھ اُس کے یاقوتی لب کھُلے اور اُس نے کہا:-

"کوئی انسان دوسرے انسان کے لئے قطعی طور سے اجنبی نہیں ہوسکتا۔ آپ آلٹروازم سے آگاہ ہوں گے۔ جی ـــــ ہر فعل دوسروں کے مفاد کے لئے "خودی" کوئی شئے نہیں۔"

میں نے اُس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اُس کو اپنے اُس مذہب سے آگاہ کرسکتا جس پر میں شدید استقلال سے قائم ہوں۔ ہر خیال ہر فعل اور ہر آرزو میں مکمل خودغرضی۔

"آلٹروازم یعنی "پرا پکار" بہترین مذہب ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟"

"جی ہاں!" میں نے بغیر سوچے سمجھے کہا۔

"آپ کو اس کمرے کا درجۂ حرارت ایک ساں قائم رکھنا چاہیئے اور ہر دو گھنٹے کے بعد اپنی دوا کی ایک خوراک پینی چاہیئے۔ اور اپنے دماغ کو قطعی طور سے آرام دینا چاہیئے اور اس کمرے میں باقاعدہ قید رہنا چاہیئے۔" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بیرونی دُنیا سے تمام گفت و شنید میری معرفت ہونی چاہیئے۔"

"ڈاکٹر نے میرے متعلق کیا کہا؟" میں نے خوبصورت سر پر نظر جماتے ہوئے کہا۔ "آخر کب تک میں اپنے پڑھنے کو ترک کئے بیٹھا رہوں۔"

"آپ کا مرض دائمی نہیں ہے تھوڑے دن میں آرام ہو جائیگا۔ مجھے آپ سے بہت ہمدردی ہے۔ جب میں نے اُن سخت دل لڑکوں کو آپ کا ذکر کرتے سُنا تو مجھے بہت افسوس ہوا۔ میں ہر طرح اور ہر قسم کی خدمت کو تیار ہوں۔"

آخری الفاظ انتہائی ہمدردی کے حامل تھے اور میری تربیت یافتہ "خود پرستی" کو بہت مرغوب ہوئے۔ فی الحقیقت اُس کی وجہ سے مجھے علالت میں بڑی مدد ملے گی۔ تو "میرے جاں نثار دوست" میرے بیمار ہو جانے سے بہت خوش ہیں اور کیوں نہ ہوں میں اس حالت میں اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میرے دل میں ایک خوفناک جذبۂ انتقام پیدا ہوا لیکن ساتھ ہی احساس

شکست نے میرا دل توڑ دیا۔ کچھ دیر میں اسی دماغی کشمکش میں غرق رہا۔ جب حواس بجا ہوئے تو مجھے خیال آیا کہ آخر یہ ہستی جو میرے ساتھ اس قدر خلوص اور بے لوث ہمدردی سے پیش آ رہی ہے کیوں میرے بیجا عتاب کی مورد ٹھیرائی جاتے ہیں نے تشکر آمیز لہجہ میں کہا:۔

"میں سمجھ نہیں سکتا آپ کے اس خلوص اور کرم کا کس طرح شکریہ ادا کروں" پھر فوراً ایک خیال میرے دماغ میں آیا۔
"کیا آپ میڈیکل کالج میں تعلیم پاتی ہیں؟"
"جی ہاں میں یہیں پڑھتی ہوں اور اب میرا امتحان بالکل قریب ہے"
"تو آپ کو بہت تشویش رہتی ہوگی"
"بالکل نہیں کہ مجھے ذرا بھی فکر نہیں ہے۔ فکر مند ہونا کچھ فائدہ مند ثابت نہیں ہوتا"
"جی ہاں، ایک حد تک درست ہی۔ لیکن طالب علموں کے نزدیک تو یہ امر قریب قریب فطرتِ ثانی بن چکا ہے کہ جب امتحان کا زمانہ قریب ہوتا ہے تو ہر طالب علم کو ایک خاص قسم کی وحشت ہو جاتی ہے" میں نے اپنی شب بیداریاں یاد کرتے ہوئے کہا۔

وہ خاموش رہی۔

"اور کامیاب ہونے کے بعد آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

"میں کچھ عرصہ تک تحقیق (research) کروں گی اور آخرالامر ہندوستان واپس چلی جاؤں گی"!

"معلوم ہوتا ہے آپ کو اپنی واپسی کا بہت اشتیاق ہے"! میں نے مُسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں میں اپنے عزیز وطن کے لئے بہت بے چین ہوں"! اُس نے اپنے مخصوص انداز میں خفیف سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"آپ کا عزیز وطن میرا بھی عزیز وطن ہے!" میں نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔

"جی ہاں! مجھے علم ہے۔ آپ کا دولت خانہ کہاں ہے؟" اُس نے سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔

"میں لکھنؤ کا رہنے والا ہوں۔ اور آپ؟"

"میں ایک چھوٹی سی ہندوستانی ریاست کی ایک غریب رعایا ہوں، جسکا نام میں فی الحال نہ بتاؤں گی"! اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تو آپ کو یہاں آئے ہوئے کتنا عرصہ ہوا؟"

"پونے دو برس؟"

"یہ امر آپ کے لئے بہت قابلِ ستائش ہے کہ آپ محض اکتسابِ علم کی خاطر اپنا عزیز وطن چھوڑے ہوئے ہیں؟"

"جی ہاں! اس دُنیا میں صرف ایک ہی چیز قابلِ حصول ہے۔ علم!"

اُس کا یہی فقرہ تمام افسانے کی جان ہے۔ اس قدر آہستگی لیکن یقین کے ساتھ اس فقرے کو ادا کیا گیا تھا کہ وہ ایک اٹل وثوق کا پتہ دیتا تھا۔ بالکل میرے دماغ کی صدائے بازگشت تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ فقرہ میری ہی زبان سے نکلا ہے۔ مجھے اس علم و ادب کے مرکز میں آئے ہوتے تین برس ہونے آئے لیکن آج تک میں نے اس قسم کا فقرہ اتنے مستحکم وثوق کے ساتھ کسی کی زبان سے نہیں سُنا۔

ایک طویل خاموشی کے بعد میں نے پوچھا "کیا آج کل آپ بہت محنت کر رہی ہیں؟"

"جی ہاں، ایک حد تک ــــــ مجھے افسوس ہے میں آج شام کو حاضر نہ ہو سکوں گی، ایک لیکچر میں شریک ہونا ہے، لیکن میں آپ کے لئے کچھ "تفریحی لٹریچر" کی قسم سے بھیجوں گی اور پھر رات کو

خود حاضر ہو نگی۔"

"شکریہ" میں نے دبی زبان سے کہا۔

"مجھے اُمید ہے کہ میں رات کو آپ کو بہتر حالت میں پاؤں گی۔"
کہتی ہوئی کھڑی ہوئی۔ میں بھی کھڑا ہوا اور کہا "مجھے اُمید ہے
آپ حسب وعدہ ضرور آئیں گی"۔ اُس نے ایک لقرئی قہقہہ لگایا
اور "جی ہاں" کہتی ہوئی رُخصت ہوگئی فوراً ہی مجھے افسوس ہوا کہ
میں نے اُس کا نام دریافت نہیں کیا۔ کیوں نہ میں نے اس کی
بابت اور کچھ معلوم کیا۔ میری طبیعت گھبرانے لگی اور میرا کمرہ
روزمرّہ سے زیادہ خالی خالی سا نظر آنے لگا۔ مجھے پہلی مرتبہ اس
بات کا احساس ہوا کہ میں کسی ایسے معقول دوست کے ساتھ
رہا ہوں جس کے ساتھ میں اور زیادہ رہنا پسند کرتا ——
صرف پہلی مرتبہ۔

دو بجے کے قریب پنچ آیا اور اس کے ساتھ بہت سی مصوّر
پنچ اور مزاحیہ افسانے۔ میں نے اُنہیں دلچسپی کے ساتھ پڑھا اس
کے بعد میں قیلولہ کی نیت سے لیٹ گیا۔ جب آنکھ کھُلی تو اندھیرا
تھا۔ میں اُٹھا، لیمپ جلایا، مُنہ دھویا، کپڑے بدلے اور آتشدان
کے قریب ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرا دل ایک خوشگوار احساس

سے معمور تھا۔ میں شاید اس احساس سے بہت خوش تھا۔ اچانک مجھے انتظار کی تلخیاں محسوس ہونے لگیں۔ جیوں جیوں میں اس "احساس" کو محسوس کرتا تھا میرا دل گھبراتا تھا۔ آخر میں کس کا منتظر تھا۔۔۔؟

ایک "ہم خیال دماغ" کا۔۔۔!!!
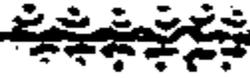
تیسرا باب

نمو

دو ہفتے سے زیادہ گزر چکے تھے اور میں اب قریب قریب بالکل تندرست تھا۔ پھیپھڑے بالکل ٹھیک ہو گئے تھے اور اپنا فعل بہ حسن و خوبی انجام دے رہے تھے۔ کھانسی قطعی مفقود ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر میرے پاس سے ابھی ابھی گیا تھا۔ اس کا یہ حکم، کتنا مسرت انگیز تھا، "اب تم اپنے کام کی طرف رجوع ہو سکتے ہو، ہفتہ عشرہ میں تم اپنی کھوئی ہوئی توانائی کو خود بخود حاصل کر لوگے!" میں اس گھڑی کا کتنی بے چینی کے ساتھ منتظر تھا جب کہ میں دو بارہ اپنے محبوب ترین مشغلہ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاؤنگا۔ علاوہ ازیں آئی۔ سی۔ ایس میں اوّل نمبر پاس ہونے کی آرزو ایسی نہ تھی جسے میں بآسانی بھلا سکتا اور مجھے یقین تھا کہ وہ اعزاز جس کو حاصل کرنے کی میں اتنے عرصے سے شدید کوشش کر رہا تھا، مجھے ایک نہ ایک دن ضرور ملے گا اور اپنے نظریہ کے مطابق میں اس کا مستحق بھی تھا۔

ایسی صورت میں جب کہ تمام لواحقین کی اُمیدیں میری ذات سے وابستہ تھیں، میرا اس اعزاز کو حاصل کرنا بالکل ناگزیر تھا۔ میں اُس کو حاصل کر کے رہوں گا چاہے اس تلاش و تجسس میں مجھے کیسی ہی قربانی کرنی پڑے۔ میں سدا سے اس مسئلہ پر کاربند رہا ہوں کہ دماغ ہمیشہ جسم پر فتح پاتا ہے ـــــ یعنی یہ کہ ایک پختہ اور قوی دماغ جسمانی کمزوریوں کو محسوس نہیں کرتا۔ یہ بھی ضرور ہے کہ جسم کے ساتھ اس جابرانہ برتاؤ کی قیمت جو ہمیں ادا کرنی پڑتی ہے وہ اکثر بہت زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن شاید میرے ساتھ ایسا نہ ہو۔ بہرحال! جو کچھ بھی ہو دیکھا جائیگا۔

اس وقت میرے دماغ میں صرف یہی خیالات نہیں تھے بلکہ کچھ عجیب سی قسم کے مبہم اور حزن آمیز خیالات تھے جو بے چینی کے ساتھ ساتھ احساس مسرت بھی پیدا کر رہے تھے۔

کوئی دو ہفتے سے میں اپنے دل میں ایک عجیب قسم کا میٹھا میٹھا سا درد محسوس کر رہا تھا "جسمانی درد" نہیں بلکہ "روحانی درد" اور اسی وجہ سے وہ میرے نزدیک زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ اس درد کا منبع کون تھا؟ ایک دوسرا انسان! چندرا موہنی میرے پاس روز آتی رہی۔ دن رات وہ میری تیمارداری میں اتنے خلوص اور اتنی محبت

سے مصروف رہی کہ شاید میرا قریب ترین عزیز بھی اتنا نہ کر سکتا۔ اُس نے ٹھنڈی ہوا کی خفیف سی رمق کو بھی میرے پھیپھڑوں میں داخل ہونے سے رُوکا۔ اُسی نے میرا آتشدان دو ہفتہ تک برابر روشن رکھا۔ وہی میرا پرہیزی کھانا تیار کرتی تھی۔ اور آج یہ صرف اُسی کی بدولت ہے کہ میں اپنے آپ کو تندرست پاتا ہوں، اُس نے میری خاطر اپنے بہت سے لمحے کھوئے۔ غرض یہ کہ وہ میری تیمارداری میں اس درجہ غرق ہوگئی تھی کہ اُسے اپنے پڑھنے لکھنے کا بھی ہوش نہ تھا اور میرا بہکا ہوا دماغ کبھی اس قابل نہ ہوا کہ میں اس کا شکریہ بھی ادا کر سکتا۔ اب جبکہ چندرا میری طرف سے اطمینان کر کے اپنے فراموش کردہ درسیات کی طرف مائل ہے، میں اس کی تمام پُرخلوص عنایتوں کو صحیح طور سے محسوس کرتا ہوں۔ صرف یہی نہیں بلکہ مجھے اس بات کا اب یقین ہوگیا ہے کہ اُس کے محبت آمیز وطیرہ نے مجھے پوری طرح سے موہ لیا ہے! مجھے اس عجیب قسم کے احساس کی اہمیت کا اتنا خیال نہیں جتنا اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں یہ احساس بڑھ نہ جائے۔

روز بروز ہم دونوں میں بے تکلفی پیدا ہوتی گئی یہاں تک کہ اُس کی غیر معمولی ذہانت، حیرت افزا رحم دلی اور ہمدردانہ فطرت

نے میرے دل میں گھر کر لیا۔ جب میں گذشتہ دنوں کو یاد کرتا ہوں تو میں دیکھتا ہوں کہ جب وہ میرے پاس ہوتی تھی تو میں خوش رہتا تھا۔ جب جاتی تھی تو رنجیدہ ہوتا تھا، جب غیر حاضر ہوتی تھی تو منتظر رہتا تھا اور جب وعدے کے مطابق نہ آتی تھی تو بے چین رہتا تھا۔ غرض یہ کہ میں اپنے کام کے علاوہ کسی اور چیز کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ وہ دوسری چیز کیا تھی؟ ایک انسان! جو میں اس سے پہلے گوارا نہ کر سکتا تھا۔ اور حاصل کیا تھا؟ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ ولایت سے واپسی پر اپنی ریاست میں چلی جائیگی۔ دوسری بات یہ کہ وہ ہندو تھی اور میں مسلمان۔ بغیر کسی معقول وجہ کے ہم دونوں میں سے کوئی بھی تبدیل مذہب کے لئے تیار نہ تھا۔ تیسرے یہ کہ ہم دونوں اپنے اپنے خاندان کے ساتھ قطعی طور سے منسلک تھے اور ہم میں سے کسی ایک کا دوسرے کے ساتھ شامل ہو جانا اپنے خاندان کو بالکل ترک کر دینے کے مترادف تھا اور یہ ذرا قابل غور بات تھی!

"نہیں جی! یہ سب حماقتیں ہیں۔ دُنیا میں کسی چیز کی پروا کرنا بالکل بے وقوفی ہے۔" میں نے دوڑتے ہوئے بادلوں پر نظر جماتے ہوئے کہا۔ "دوستی، موانست، اُلفت، یہ سب چیزیں ایک

سی ہیں۔ اگر "مقصود" آپ کے پاس ہے تو فکر اور تردد اور اگر "مقصود" کو آپ کھو چکے ہیں تو پریشانی اور تکلیف کے علاوہ کچھ حاصل نہیں۔ مزید یہ کہ تمام چیزیں آپ کے کام میں حارج ہونے والے اثرات پیدا کرتی ہیں۔ میری زندگی اب تک اپنے "کام" کی پرستش میں صرف ہوئی، اور ایک قابلِ قدر حد تک تمام انسانی "جذباتِ لطیف" سے قطعی ناآشنا رہی اور اسی وجہ سے میں نے اپنے آپ میں اتنی غیر معمولی قابلیت پیدا کر لی ۔۔۔ بہرحال! مجھے پھر اپنا کام سنبھالنا چاہیئے اور کامیابی یقینی ہے۔ پھر اس کے بعد ۔۔۔ پھر تمام لوگ میری کامیابی پر عش عش کریں گے۔ میرے والدین خوشی سے پھولے نہ سمائیں گے، اور پھر، دو برس کے بعد میں اپنے پیارے وطن جاؤں گا ڈپٹی کمشنر بن کر اور پھر کمشنر ۔۔۔! اور کبھی کسی صوبے کا گورنر۔ جب تک شاید ہندوستان آزادی حاصل کر لے اس لئے اپنی غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے شاید وہ اُس نے بہادر ۔۔۔ جی ۔۔۔؟؟ بہرحال! جو کچھ بھی ہو میرا مستقبل نہایت خوشگوار ہے۔ زندگی بذاتِ خود درحقیقت کتنی پھیکی اور بے رنگ چیز ہے، مگر بادی النظر میں کیسی درخشاں اور اُمید افزا نظر آتی ہے۔ اسی بنا پر میں اپنے مستقبل کو خوشگوار سمجھو۔

کرنے میں ایک قابل قدر حد تک بڑھ چکا ہوں. قرائن بھی تو کچھ اہمیت رکھتے ہیں۔

میں مسکرایا ـــــ اور کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر کرسی پر لیٹ گیا. میرا دماغ مطمئن نہیں تھا لیکن میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو سکا میں چندرا سے بہت کم تعلق رکھوں گا. میں نے اپنی کتابوں میں سے کچھ ضروری کتابیں لیں اور پروفیسر جیمز کے پاس چلا گیا۔

دوسرے دن صبح کو میں آدھا سوتا اور آدھا جاگتا ہوا لیٹا تھا اور اٹھ جانے کا فیصلہ کر ہی رہا تھا کہ میرا دروازہ کھلا اور میں نے اپنی نیم وا آنکھوں سے دیکھا کہ چندرا ایک کشتی میں چائے وغیرہ لے کر آئی. اس نے میری طرف دیکھا اور یہ خیال کر کے کہ میں شاید سو رہا ہوں وہ نہایت خاموشی سے میری میز کے پاس گئی اور ناشتہ اس پر رکھ کر چلنے کے لئے تیار ہوئی. میں نے اپنی آنکھیں کھولیں اور اس کو آواز دی. وہ بالکل نہیں چونکی بلکہ اپنے مخصوص قہقہے کے ساتھ واپس میرے قریب آئی اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی ـــــ "تو آپ جاگ رہے ہیں؟ اب کیسی طبیعت ہے؟ میں آپ کا ناشتہ لیتی آئی تھی اس خیال سے کہ ابھی آپ میں اتنی طاقت

نہیں ہے کہ آپ خود کالج کے ڈائننگ ہال میں جا سکیں۔"

"چندرا! تم آخر کیوں میرے لئے اتنی تکلیف گوارا کرتی ہو" میں نے ایک کہنی پر سہارا لیتے ہوئے کہا۔

"صرف اس وجہ سے کہ آپ انسان ہیں، دوسرے یہ کہ ہندوستانی ہیں، اور تیسرے یہ کہ بیمار ہیں، اور چوتھے یہ کہ میں ہمیشہ ہر قابل شخص کی خدمت اپنا فرض سمجھتی رہی ہوں۔"

"خوب!" میں صرف مسکرا کر یہی کہہ سکا۔

"میری ہمیشہ سے یہی تمنا رہی ہے کہ میں آپ کی کوئی بھی اور کسی قسم کی بھی خدمت کر سکوں۔ اچھا آپ ناشتہ کیجئے میں ابھی بیان کرتی ہوں۔ آپ نے کلاسیکل زبانوں میں کونسی لی ہے؟"

"فارسی!" میں نے چائے بناتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ کو اُسکی طرف سے اطمینان ہے؟"

"بالکل!"

"اور ہندوستانی زبانوں میں سے کونسی لی ہے؟"

"اُردو تو خیر میری مادری زبان ہے، گجراتی اور لی ہے لیکن میں اس میں بہت کمزور ہوں۔"

"خوب! تو گجراتی کا میں ذمہ لیتی ہوں۔" اتفاق سے گجراتی میری

مادری زبان ہے۔" چندرا نے کہا اور میں حیرت سے اس کے چہرے کی طرف ٹکٹکی لگائے تھا۔ "تین مہینے کے اندر اندر گجراتی کو آپ ایسا سمجھنے لگیں گے جیسے اردو کو۔ اور کم از کم ۲۰۰ نمبر آپ کو اس میں ضرور مل جائیں گے اور کچھ ایسی زیادہ محنت بھی نہیں کرنی پڑیگی۔ صرف ایک گھنٹہ روز آپ میرے ساتھ پڑھیں۔ غالباً رات کا وقت زیادہ موزوں ہوگا۔ جی ؟"

وہ کرسی پر سے کھڑی ہو گئی تھی اور میرے بالکل قریب کھڑی تھی، میں اس کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا اس کا چہرہ خدا داد ذہانت سے اس قدر روشن تھا کہ وہ ایک حساس وضو فشاں روح کا ایک چمکدار عکس معلوم ہوتا تھا۔

"میں ایک گھنٹہ سے ایک لمحہ بھی زیادہ دینے کے لئے تیار نہیں۔ آپ ہر رات کو آٹھ سے نو تک میرے پاس آیا کریں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"اوہ! بہت کافی ہے، اچھا اب میں رخصت ہوتی ہوں اس لئے کہ آپ شاید میرے روبرو ناشتہ کرنے سے خائف ہیں۔" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "میں آج آٹھ بجے حاضر ہوں گی، خدا حافظ۔"

اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہہ سکوں وہ جا چکی تھی۔

ایک ماہ سے زیادہ عرصہ گذر گیا اور کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ چندرا بلا ناغہ میرے پاس آتی تھی اور پورے ایک گھنٹے تک گجراتی پڑھ کر رخصت ہو جاتی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ "خدا وندان کالج" کی طرف سے اس آمد و رفت کی بابت کچھ نہ کچھ احکام ضرور نازل ہوں گے اور خدا معلوم کیا کیا نہ ہو، لیکن یہ ایک عجیب سی بات ہے کہ جب ہم اپنے متعلق کسی سانحہ کے لئے تیار رہتے ہیں تو وہ اکثر ظہور ہی میں نہیں آتا اور اگر آتا بھی ہے تو ان نتائج کی شکل میں نہیں جن کا کہ ہم کو اپنی پیش بینی کی بنا پر خدشہ رہتا ہے۔ بہر حال چندرا آتی رہی اور کسی صاحب مجاز نے چوں بھی نہیں کی۔ یہ ضرور ہے کہ چندرا اپنے آنے اور جانے میں وہ تراکیب استعمال میں لاتی تھی جو خاص ایشیا کی پیدائش کا اثر ہیں۔ مکاری اور چالاکی، لیکن اس کے دوش بدوش آزادی اور بغیر کسی خوف کے ساتھ وہ میرے پاس آتی رہی۔

میں سختی کے ساتھ صرف ۶۰ منٹ پر قائم رہتا تھا اور اکثر ایسا بھی ہوا کہ ہم کسی نہایت ہی دلچسپ بحث میں محو ہیں لیکن ایک گھنٹہ پورا ہو جانے پر میں اُسے زبردستی چلے جانے کو کہتا۔ یہ کہنا فضول ہے کہ کتنی محنت، جانفشانی اور محبت سے وہ مجھ کو گجراتی

پڑھا رہی تھی بلکہ گھول کے پلا رہی تھی۔ اس لئے کہ اب میں نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ کالج بھر میں میرے مقابلہ میں کوئی نہیں آسکتا تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ چندرا میرے کمرے میں آئی بہت نحیف اور نڈھال، چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی۔ لیکن اُس نے ہمیشہ اپنے مخصوص قہقہوں سے اس بات کے اقرار کرنے سے انکار کیا کہ وہ "تکان یا کسل محسوس کر رہی ہے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وہ مضمحل ہے، بالکل میری طرح لیکن اپنی کامیابی کی تشنگی میں میں نے ان باتوں کی بھی پرواہ نہیں کی۔ کامیابی اور اعزاز کی تمنّا میرے رگ و ریشہ میں سرایت کئے ہوئے تھی اور اس تمنّا کے بھینٹ میں صرف اپنے ہی وجود کو نہیں بلکہ ساری دُنیا پُن کر دینے کے لئے تیار تھا، اگر ایسا کرنے سے میری آرزو بر آتی!

لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ مضمحل چہرے کی مختلف ادائیں اور تھکے ہوئے قہقہوں کی گونجتی ہوئیں آوازیں "ایغو اعظم" کو اپنا مطیع کرتی جا رہی ہیں۔ میں اس واقعہ سے قطعی طور سے نابلد تھا کہ اس کا وہی درد بھرا احساس میرے اعماقِ قلب میں جذب ہوتا چلا جا رہا ہے۔ میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ میں علاوہ اپنے کام کے کسی اور طرف رجوع کروں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

اُس کا احساس، میرے دل میں قطعی طور سے جاگزیں ہو گیا ہیں نہیں جانتا تھا کہ میں اپنے ذہین اور متین ہم جلیس کی ہمدردی کا کتنا محتاج ہو گیا ہوں، اور جان بھی کیسے سکتا ہوں — ایک کمزور شخص ایک معمولی لکڑی کے سہارے چلتا ہے۔ لیکن جب تک کہ آپ اُس کے ہاتھ سے وہ لکڑی لے نہ لیں اس وقت تک اسے اس بات کا علم نہیں ہو سکتا کہ وہ لکڑی اُس کو کتنا سہارا دے رہی ہے۔

ایک مہینہ اور اسی طرح گذر گیا اور اب میرا امتحان بالکل قریب تھا میں مجبور تھا کہ پچھلے پڑھے ہوئے کی نظر ثانی کروں۔ اس لئے میں لے چندرا سے مشورہ کیا اور گجراتی پڑھنے کا ایک گھنٹہ موقوف ہو گیا۔ لیکن میں نے یہ محسوس کیا کہ میں چندرا سے بغیر ملے زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے میں نے اُس سے اپنے ہاں آنے کا وعدہ لے لیا۔ وہ آٹھ بجے آتی تھی اور نو بجے تک اپنی کتابیں پڑھتی رہتی تھی اور چلی جاتی تھی۔ اس دوران میں ہم شاذ ہی کوئی گفتگو کرتے ہوں، اس لئے کہ میں اپنے کام میں مصروف رہتا اور وہ اپنے کام میں۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ چندرا اُسی کرسی پر گول مول ہو کر سو گئی لیکن مجھے اُس کی موجودگی ہی سے مسرت محسوس ہوتی تھی۔ میں کبھی کبھی نظر اُٹھا کر دیکھ لیتا۔ جوانی کی سرشار نیند کا آگ کی چمک

اُس کے سیاہ بالوں پر رقص کرتی ہوئی اور اُس کی پیشانی والی عمودی رگ جو مجھے خاص طور سے نہایت ہی بھلی معلوم ہوتی تھی، لیمپ کی روشنی میں نمایاں طور سے چمکتی ہوتی۔ وہ بے خبر سویا کرتی اور میں پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا!!!

ایک رات ہم دونوں پڑھنے میں مصروف تھے۔ میں میز کے ایک سرے پر بیٹھا "پلاٹس" کی کتاب (Republic) پڑھ رہا تھا اور وہ میرے روبرو میز کے دوسرے سرے پر بیٹھی اناٹومی (Anatomy) کی ایک موٹی سی کتاب پڑھ رہی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان ایک چھوٹی سی کشتی رکھی ہوئی تھی۔ میرا ایک ہاتھ میز پر پڑی ہوئی پنسل سے کھیل رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی گرم سی چیز میرے ہاتھ سے مس ہوئی، چونک کر میں نے دیکھا کہ اُس کا شفّاف گندمی ہاتھ میرے ہاتھ پر تھا۔ "یہ آپ کا ہاتھ یہاں کس غرض سے آیا؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اس لئے کہ آپ کا ہاتھ وہاں تھا، محض کشش!" اُس نے نہایت متانت سے جواب دیا۔ میں نے اپنا ہاتھ اُٹھا لیا اور بظاہر بہت غور سے پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے کتاب بند کئے بغیر اپنی آنکھ کے گوشوں سے دیکھا۔ وہ پڑھنے میں

محو تھی اور بالکل ساکت، وہ خوشنما ہاتھ جس کو میں نے جھٹک دیا تھا "انا ٹومی" کے قریب رکھا ہوا تھا۔ اور وہ دوسری کہنی سے سہارا لیئے کتاب میں غرق تھی۔ میں اس کی طرف دیکھتا تھا اور میرا دل جذبات کے طوفان میں امڈا مڈ کر اس پر نثار ہو جانا چاہتا تھا۔ اسکا انداز نشست کتنا تمکنت آمیز، کتنا مغرور اور بے پرواہ تھا اور میں اُس کے مقابلے میں کتنا حقیر، کتنا بدنما اور معیار سے گرا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اپنے اندرونی جذبات کو الفاظ یا کسی حرکت میں ظاہر کر دوں۔ اُس گداز اور بھرے ہوئے بازو کو مس کرنے کی آرزو میرے دل میں پیدا ہوئی۔ وہ میرے بالکل قریب تھا۔ لیکن چندرا کے سکوت اور محویت نے مجھے بزدل بنا دیا۔ میں نے دیکھا اور بغیر کسی حرکت کے خاموش بیٹھا رہا۔

میرے ہاتھ بھیج گئے اور میری پیشانی پر خفیف سا پسینہ نمودار ہوا۔ میرا خون میری رگوں میں اُبلتا ہوا معلوم ہوا۔ ایسا معلوم ہوا کہ میری کنپٹیاں اب پھٹ جانے والی ہیں۔ احساسات کے اس طوفان سے میں بالآخر مغلوب ہو گیا ـــــ ایک ہلکی سی آہ میرے دل سے بے ساختہ نکلی اور میرا سر کتب سے ٹک گیا۔ میں نے چندرا کو لُٹھتے ہوئے سُنا اُس نے ایک جھٹکے سے کرسی کو

پیچھے سرکا یا اور میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ مکمل خاموشی تھی سوائے آتشدان کی سن سن کے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی پھر میں نے اپنے ماتھے پر ایک نرم و گرم لمس محسوس کی۔ میں نے اپنا سر اُٹھایا۔ سیاہ آنکھیں ۔۔۔ ذی حیات روشنی اور درخشانی کے گہرے اور تاریک کنوئیں ۔۔۔ میرے اوپر تھے اور میں ایک عالمِ تشنگی میں اپنی دل کی پیاس بجھانے کے لیے اُن کی گہرائیوں میں سرگرداں تھا۔ "کیا ہوا؟ کیسی طبیعت ہے؟" میرے کانوں میں آواز آئی۔ اتنی ہلکی آواز تھی کہ شاید ہوا کو بھی جنبش نہ ہوئی ہو۔ "کچھ نہیں!" میں نے خدا معلوم کس طرح کہا۔ "میری رُوح ایک نئی آرزو میں مبتلا ہو گئی!"

"کیا میں کسی کام آ سکتی ہوں؟"

"ہاں!" میں نے کہا۔ "چندرا تم میرے پڑھنے میں حارج ہو!" اور بغیر کچھ کہے سُنے میں نے اس کو زبردستی دروازے سے دھکیل دیا۔ اُس نے قطعی مدافعت نہیں کی بلکہ اپنی کتاب مجھ سے مانگ کر غائب ہو گئی!!

میں تنہا تھا مگر بالکل تنہا نہیں! میرا دماغ اپنے ہم جلیس سے جدا ہو جانے سے غضب ناک تھا اور صاف طور سے میرے اس خلافِ توقع رویہ کا سبب دریافت کر رہا تھا۔ میں نے

آخر کیوں ایسے وحشیانہ طریقہ پر اس کے ساتھی، اُس کے محبوب کو جُدا کیا۔ مکمل سکوت میں میں اپنی روح کی آہ و بکا سُن رہا تھا۔ وہ اپنے محبوب کے جُدا ہو جانے سے کس قدر بے چین تھی !!۔

چوتھا باب

دوسرے دن میں دیر سے بیدار ہوا میرے دل میں ایک عجیب سا
خیال تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں نے کسی چیز کو گم کر دیا ہے پھر
جیسے ہی کہ دن کی چمکدار روشنی میرے اوپر پڑی، گذشتہ رات
کے تمام واقعات یکے بعد دیگرے میرے ذہن میں آنے شروع ہوئے
میں نے محسوس کیا کہ کس طرح ایک انسان کی محبت میرے دل
میں رفتہ رفتہ جاگزیں ہوتی گئی۔ گذشتہ رات کو خوف اور ناامیدی
سے بیتاب ہو کر "الغور اعظم" یعنی "میں" تڑپا لیکن فوراً ہی یہ یقین
ہو گیا کہ "میں" نے اپنے آپ کو ایک دوسرے انسان کی اُلفت
میں اس طرح جکڑ دیا ہے کہ اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں
کہ اس کے در ناز پر ہمیشہ کے لئے سر نیاز جھکا دیا جائے۔ تلاش
علم کی بجائے اب میں تلاش محبوب میں سرگرداں ہوں۔ علم کی
خاموش صداؤں کی بجائے اب میں ذی حیات نغمے سننے کے لئے بیتاب

ہوں بجائے تخیلات میں غرق رہنے کے اب میں نظارۂ دوست میں محو رہتا ہوں گویا میرے معبود ہیولیٰ نے اب ایک دوسرے انسان کے وجودِ خاکی کی صورت اختیار کر لی ہے۔

میری گذشتہ محنت، میری کامیابی کی اُمید، دوسروں کا مجھ سے حسد اور میرا درخشاں مستقبل، یہ تمام چیزیں چندرا کی محبت کے مقابلے میں کس قدر حقیر اور کس قدر بے وقعت معلوم ہوتی تھیں ــــ ایک صحرا، ایک لق ودق میدان، ایک جھونپڑی، ایک قید خانہ، ایک پھانسی کا تختہ، یہ تمام چیزیں چندرا کے ساتھ کس قدر دلنواز اور آرام دہ معلوم ہوتی تھیں لیکن اس کے برخلاف بے شمار دولت، ایک سلطنت، ایک لازوال شہرت اور وہ تمام چیزیں جو دُنیا مہیا کر سکتی ہے، بغیر چندرا کے کس قدر تکلیف دہ اور ابتلا انگیز تھیں ــــ لیکن یہ کتنا محال ہے، محض خبط ہے، چندرا کو حاصل کرنا قطعی ناممکن، مقابل کی دیوار پر آگ کے چمکتے ہوئے اور جلی حروف میں "حماقت" لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ جب چندرا ہندوستان واپس ہو جائے گی تو اپنی ریاست میں جا کر گم ہو جائے گی، اپنے عزیزوں، اپنے رشتہ داروں میں گھر جائے گی، اور میں جب ہندوستان جاؤں گا تو خدا معلوم میرا

آب و دانہ مجھے کس جگہ پھینکے۔ شاید سرحد کے قریب یا گنگا کے پار اور حالانکہ ہم دونوں ایک ہی ملک میں ہوں گے لیکن قطعی طور سے جداگانہ طریقۂ زندگی میں گرفتار رہوں گے اور اس طرح گویا ابد تک ایک دوسرے سے جدا رہیں گے ـــــ میں جوان تھا، میرا کوئی روزگار تھا، نہ میرے پاس دولت تھی۔ جب تک کہ میں آئی۔ سی۔ ایس میں کامیابی حاصل نہ کر لوں، اُس وقت تک میرے والد میرے کفیل تھے۔ بالفعل اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ میں آزاد ہوں تو بھی خدا معلوم چندرا کے خیالات میرے متعلق کیا ہیں۔ میں نے اُس کے ہر فعل پر تنقیدی نظر ڈالنی شروع کی۔ اُس کو میرے ساتھ کتنی ہمدردی تھی۔ اُس نے کتنی محنت اور محبّت سے میری تیمارداری کی۔ اگر میں معمول سے زیادہ نڈھال ہوتا تو وہ کیسی میٹھی میٹھی نظروں سے میرے بُشرے کا جائزہ لیتی تھی۔ اُس کی ہر قسم کی خدمت کرنے کی آرزو، اُس کے نقرئی قہقہے۔ یہ تمام چیزیں میرے لئے معانی کی ایک دُنیا رکھتی تھیں۔ مجھ پر الہامی طریقے سے یہ واضح کر دیا گیا کہ یہی زندگی کا راز ہے۔ یہ بتا دیا گیا کہ یہ زندگی کا راز نہ تو کامیابی میں ہے نہ تلاش علم میں، نہ محسود ہونے میں، اور نہ آرزوؤں کے بر آنے میں، بلکہ محض کسی دوسرے انسان کی

ہم جلیسی میں پنہاں ہے۔ اور وہ دوسرا انسان کون تھا؟ ـــــ چندرا موہنی! جس کی پاک طینت اور ذی وقار شخصیت ایک مندر کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں سوائے میرے کسی دوسرے پجاری کا گذر نہیں ـــــ اچانک اس خوش گوار خواب پر ایک سیاہ پردہ پڑا۔ "تمہارے لئے نہیں، ہرگز نہیں۔ چندرا تمہارے لئے کچھ نہیں ہوسکتی سوائے ایک معمولی دوست یا ایک بسری ہوئی یاد کے قرائن تم دونوں کے خلاف ہیں۔" وہ روشنی اور وہ نور جو چندرا نے میری زندگی میں بھر دیا تھا، گذشتہ رات کو غائب ہو گیا اور میرے دل کی دنیا اسی طرح تاریک تھی جیسے پہلے۔

"بہرحال،" میں نے بلند آواز سے کہا اور کپڑے وغیرہ بدل کر ڈائننگ ہال چل دیا۔ اس کے بعد پروفیسر جیمز اور پروفیسر نکلسن کے ساتھ درسیات میں مصروف رہا۔ دوپہر بھر لائبریری میں بیٹھا رہا۔ شام کی چائے سمتھ صاحب کے ساتھ نوش کی۔ سات بجے تک اُن سے اِدھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی، ڈنر کے بعد اپنے کمرے میں واپس آیا۔ روشنی کی، کوئی نہیں آیا تھا، سنسان خاموشی حکمراں تھی۔ کچھ عرصہ تک میں چندرا کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن جب وہ نہیں آئی تو مجھے خیال پیدا ہوا کہ میرے کل کے وحشیانہ

برتاؤ سے شاید وہ ناراض ہوگئی۔ اور ناراض ہونے کی بات بھی تھی۔ ایک خاص قسم کے نقصان کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا۔ میں نے اپنے دماغ کے ہم جلیس کو گم کر دیا، افسوس۔ اور اب اس سنسان خاموشی میں میرے دماغ کو تنہا کام کرنا پڑیگا۔ کام کرنا لازمی تھا اس لئے کہ امتحان بالکل سر پر تھا۔ اس بھیانک خاموشی میں مجھے اپنے دماغ کو ان موٹی موٹی کتابوں میں دفن کر دینا پڑیگا —— اور تنہا! خیر، جو کچھ بھی ہو مجھے کام ضرور کرنا چاہیئے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے:

کئی ہفتے گذر گئے اور چندرا اور میں گویا ایک دوسرے کے لئے مر چکے تھے۔ میں نے نہ اُسے کہیں دیکھا اور نہ کہیں اُس سے ملا۔ میں اُس سے ملنے کے لئے نہیں بلکہ صرف ایک نظر دیکھنے کے لئے کتنا تڑپ رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ فوراً اُڑ کر اُس کے پاس پہونچوں۔ لیکن میں نے ضبط کیا، ابھی نہیں، ابھی مجھ کو بہت کام کرنا ہے۔ میں ہمیشہ سے اپنی بڑی سے بڑی خواہش کو رد کر دینے کا عادی ہوں۔ موسم مائل بہ گرمی ہوتا جا رہا تھا اور مجھے دن کی روشنی میں کام کرنے کے لئے زیادہ وقت ملنے لگا۔ ایسٹر کی چھٹیاں آئیں اور چلی گئیں۔ جیوں جیوں بہار کا موسم بڑھتا جاتا تھا۔

ہمارے امتحان صاحب قریب کھسکتے آتے تھے۔ ایک سنجیدگی اور ایک متانت مجھ پر ہر وقت طاری رہنے لگی۔ میں محسوس کرتا تھا کہ میں نے ہر وہ کام خوب اچھی طرح کر لیا جو انسانی دماغ کر سکتا تھا۔ میں اپنے مضامین کی باریک سی باریک بات پر حاوی تھا۔ پلیٹو کی رگ رگ پر قابض تھا۔ غرض یہ کہ کوئی کتاب، کوئی فقرہ، کوئی لفظ ایسا نہ تھا جس سے میں بخوبی واقف نہ ہوں۔ جیوں جیوں وقت زیادہ گزرتا جاتا تھا، میں زیادہ بشاش ہوتا جاتا تھا۔ اپریل کی ایک سنہری شام کو میں نے اپنی تمام کتابیں اٹھا کر پٹخ دیں اور ایک طویل اطمینان کا سانس لیا۔ پہلی مرتبہ میرا کمرہ میرے ایک ہنگام آفریں قہقہے سے گونج گیا۔ میں نے اپنے پائپ میں معمول سے زیادہ تمباکو بھرا اور اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پارک میں ٹہلنے کے ارادے سے روانہ ہوا۔ ابھی میں تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ شام کی ساکن فضا میں مجھے کچھ آوازیں سنائی دیں۔

"گرلز میڈیکل کالج کی ایک ہندوستانی لڑکی اوّل نمبر پاس ہوئی۔"

"کیا واقعی؟ بھئی یہ ہندوستانی غضب کے تیئے ہوتے ہیں۔ پچھلے سال آئی۔سی۔ایس میں بنرجی فرسٹ آیا تھا۔"

میں نے چونک کر دیکھا دو پروفیسر باتیں کرتے ہوئے چلے جارہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ فرسٹ آنے والی ہندوستانی لڑکی سوائے میری چندرا کے دوسری نہیں ہوسکتی۔ فوراً ہی مجھے خیال آیا کہ اب وہ کہیں چلی نہ جائے۔ ایک دن اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ڈاکٹری کے بعد کچھ تحقیق (research) کروں گی۔ کیا معلوم اُس نے اپنا ارادہ بدل دیا ہو اور اب وہ ہندوستان جانیوالی ہو۔ میں فوراً ہی پلٹا اور لان پر سے گذرتا ہوا ایک دوسری روش پر چلنے لگا۔ مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ میں کہاں جارہا ہوں۔ میرا دل حلق کے پاس دھڑکتا ہوا معلوم ہورہا تھا۔ صرف ایک آرزو تھی اور صرف ایک تمنّا۔ کسی نہ کسی طرح میں چندرا سے فوراً مل سکتا۔ وہ جارہی تھی۔ وہ ایک ہستی جس کی میں عزت کرتا تھا جسکی میں پرستش کرتا تھا۔ مجھ سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہونے والی تھی۔ میں تیزی سے میڈیکل کالج کی طرف چلا جارہا تھا بغیر یہ سوچے ہوئے کہ چندرا مجھ سے اُس وحشیانہ حرکت کے بعد مِلنا پسند بھی کرے گی یا نہیں۔ ایک بات کا مجھے یقین تھا کہ چندرا بغیر میری حالت سُنے مجھے نہیں دھتکارے گی۔ میں جو کچھ اُس سے کہتا وہ ہمیشہ تسلیم کرلیتی تھی اور اسی اطمینان بخش خیال کی اُمید پر میں تیزی

سے چلا جا رہا تھا۔ میں کالج کے بالکل قریب پہونچ چکا تھا۔ اتفاق سے مجھے ایک نرس دکھائی دی میں نے اُس سے پوچھا "کیا آپ بتا سکتی ہیں اِس وقت چندراموہنی کہاں مل سکتی ہیں ؟"

"جی ہاں ! وہ اس لیبوریٹری میں ہیں۔"

میں تیزی سے لیبوریٹری کے اندر گھس گیا۔ سامنے کی دیوار میں دو بڑی بڑی کھڑکیوں میں سے ہلکی سی روشنی آ رہی تھی اور گہرے سبز آسمان کا کچھ حصّہ بھی نظر آ رہا تھا لیکن روشنی اتنی ناکافی تھی کہ کمرے کے دونوں سرے مکمل تاریکی میں تھے۔ آخیر والی کھڑکی کے سامنے چھ سات طالبات کھڑی تھیں۔ جھٹپٹا وقت تھا مگر میں نے اُن میں چندرا کو فوراً پہچان لیا۔ میں اس کو ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ کھڑکی کی طرف پُشت کیئے کھڑی تھی اور تمام لڑکیاں اس کے گرد تھیں، وہ اُن کے سامنے اپنے امتحان کے حالات بیان کر رہی تھی۔ اور تمام لڑکیاں اس کے تجربوں کو بغور سُن رہی تھیں۔ میری ترسی ہوئی آنکھیں تاریکی میں سے اُس کی ایک ایک حرکت کو اپنے اندر جذب کر رہی تھیں۔ اُس کی شاندار شخصیت اُٹھکا خوبصورت سر اور سڈول گدرایا ہوا جسم اور وہ پیشانی والی عمودی رگ یہ تمام چیزیں مجھے اپنی طرف کھینچے لیتی تھیں۔ میں اُسکی کیسی پرستش

کرتا تھا۔ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ اپنی تمام مقبوضات اور اپنی تمام قابلیتیں صرف ایک مخصوص قہقہے کی خاطر اُس پر نثار کر دینے کو تیار ہوں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اپنی ہر تڑپتی ہوئی نبض کو کاٹ کر اپنے نحیف اور نزار جسم کا تمام خون اُس کے حسین ایشیائی قدموں میں بہا دوں، صرف اس کی ایک ہمدردی سے لبریز اور ترحم آمیز نگاہ کی خاطر ـــــ! اور مجھے یہ دونوں انمول چیزیں حاصل تھیں۔ ہزاروں مرتبہ میرا حقیر کمرہ اُس کے نقرئی قہقہوں سے گونج چکا ہے اور لاکھوں مرتبہ میں نے اُن سیاہ حسین آنکھوں کو ہمدردی سے لبریز دیکھا ہے لیکن کیا میں نے اپنے منحوس کام کے سامنے ان آسمانی تحائف کو ٹھکرا نہیں دیا۔

شام کی سیاہی پھیلنے لگی اور میں انتظار کرتا رہا۔ آخرکار لڑکیوں کا دائرہ ٹوٹا اور وہ دروازے کی طرف بڑھیں۔ میں نے چندرا کو دیوار سے لگی ہوئی ایک بڑی الماری کی طرف جاتے دیکھا۔ لڑکیوں میں سے ایک نے کہا "چندرا موہنی! تم نہیں آؤ گی کیا؟" "آتی ہوں، تم چلو، ذرا ان شیشوں کو بند کر دوں۔" چندرا کی مترنم آواز نے میرے دل کی دھڑکن کو اور زیادہ تیز کر دیا۔ تمام لڑکیاں ایک ایک کر کے رخصت ہو گئیں اور اُن میں سے کسی نے

مجھے نہیں دیکھا۔ مکمل خاموشی تھی۔ کبھی کبھی شیشوں کے آپس میں ٹکرانے کی خفیف سی آواز میرے کان کھڑے کر دیتی تھی۔ کئی منٹ گذر گئے لیکن میں تاریکی سے آگے نہ بڑھا۔ پھر میں نے الماری بند ہونے کی آواز سنی اور اُس کے بعد چندرا کے قدموں کی آواز۔ اُس کی رفتار کتنی سُبک تھی! جیسے ہی کہ وہ دروازے کے قریب پہونچی میں فوراً تاریکی میں سے نکل کر روشنی میں آگیا۔ میرا دم گھٹ رہا تھا، اور میری آواز بالکل مُردہ تھی، میں نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دئے۔

"اوہ! سلیم ـــــ!!!" میں نے ایک قہقہے کے ساتھ سُنا۔ اُس نے میرا ایک ہاتھ اپنے دونوں گرم ہاتھوں میں لیا اور نرمی سے اپنی شفاف ہتھیلی میں دبایا۔ سیاہ چمکدار آنکھیں مُستفسرانہ طور سے میرا جائزہ لے رہی تھیں۔

"چندرا! میں تم سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں!" میں نے لڑکھڑاتے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"یقیناً!" اُس نے سنگ مرمر کی ایک قریب کی میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

پھر ایک دم سے ایسا معلوم ہوا کہ میری کھوئی ہوئی طاقت

واپس آگئی۔ اِس خیال کے آتے ہی کہ چندرا اب جانے والی ہے اور شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہو، میری تمام ہچکچاہٹ اور تمام شرم ایک دم سے مفقود ہو گئی، اور جتنے خیالات میرے دماغ میں عرصہ سے جمع تھے سب ایک اُبلتے ہوئے چشمہ کی طرح میرے مُنہ سے نکلنے شروع ہوئے، حاصل تمام عرضِ حالات کا یہ تھا کہ میں یہ چاہتا تھا کہ چندرا اور میری دوستی ہمیشہ تک قائم رہے۔ اور اس تمام بکواس کو چندرا خاموشی کے ساتھ سُنتی رہی۔ وہ اس قدر اطمینان سے سُن رہی تھی اور میرے ہر لفظ کا یقین کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی کہ میں اپنی دُھن میں خدا معلوم کیا کیا کہتا گیا۔ پھر ایک دم سے اس کی طویل خاموشی سے میں کھٹکا اور میں نے کہا:۔

"چندرا! کیا میرے الفاظ تمہیں ناگوار معلوم ہو رہے ہیں؟"

میں بھی اُسی سنگِ مرمر پر جُھک گیا اور اُس کی سیاہ آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال دیں۔ اُس نے چونک کر کہا "ہرگز نہیں، ہرگز نہیں"۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان الفاظ نے مجھ پر کیا اثر کیا۔ میری انگلیاں کانپ رہی تھیں۔

"کیا تم واپس ہندوستان جا رہی ہو؟" میں نے فیصلہ کُن

سوال آخر کر ہی دیا اور بے چینی کے ساتھ اُس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔"

ایک طویل خاموشی کے بعد چندرا نے آہستگی سے میرے ہاتھ کو دباتے ہوئے کہا:۔

"اگر تم چاہو تو میں ٹھہر سکتی ہوں۔"

"تعجب ہے میری تمام بکواس کے بعد بھی تم یہ کہتی ہو۔ چندرا! میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میں کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتا۔ دولت، عزت، حتیٰ کہ اپنے عزیزوں سے بھی میں قطع تعلق کروں گا۔ اگر تم میرے ساتھ رہو۔" میں نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔ "مجھے امتحان تو کم از کم ضرور دینا ہے۔ لیکن مجھے کسی چیز کی بھی پرواہ نہیں، اگر تم بھی چلی جاؤ تو میں اس کی بھی پرواہ نہ کروں گا۔ لیکن ٹھیک ٹھیک بتاؤ کیا تم ٹھہر سکتی ہو؟"

"دیکھو! میں قطعی طور سے نہیں کہہ سکتی۔" چندرا نے اپنے خوبصورت بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔ "میں سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہوں لیکن اگر میں نہ بھی گئی تو آخر تمہیں تو جانا پڑیگا۔"

"میں جانتا ہوں، اور جب کبھی میں اِس بات کا خیال کرتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ لیکن مجھے اِس سے

مفر نہیں، کیا میں اس منحوس آئی۔سی۔ایس میں جکڑا ہوا نہیں ہوں ــــ! آہ!" میں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور میرے منہ سے انتہائی کرب کے عالم میں ایک خفیف سی آہ نکل گئی۔

"رنجیدہ مت ہو!" چندرا نے جلدی سے کہا اور اس کی آواز میں درد تھا۔"فی الحال تمہیں امتحان دینا ضروری ہے اُس کے بعد سب کچھ تمہاری مرضی کے مطابق ہوجائیگا۔جب تک کہ تمہارا نتیجہ نہ آئیگا میں یہیں رہونگی گھبراؤ مت!"

"لیکن جب تک کہ میرا ــــ میں اپنی آیندہ زندگی کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہ کر لوں میں ــــ آخر تمہیں یہاں ٹھہرنے پر کیوں ــــ کیوں مجبور کروں" میں نے لڑکھڑائے ہوتے لہجے میں کہا۔

"تم مجھ سے نہ کہو، میں اپنی مرضی سے ٹھہرتی ہوں۔میں ابھی واپس نہ جاتی لیکن تمہارے اُس دن کے انفاظ سُنکر میں نے ارادہ بدل دیا تھا۔میں نے جب اپنے چچا کو اپنی واپسی کی اطلاع کی تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں تمہاری پڑھائی میں حارج ہوئی۔ اور یہ کہ میں سوائے نقصان کے تم کو کوئی فائدہ نہ پہنچا سکی لیکن

اب میں تمام حالات سے آگاہ ہوگئی اور اب یہاں ٹھیرونگی، اس لئے نہیں کہ تمہاری مرضی ہے بلکہ صرف اس لئے کہ میرا جی چاہتا ہے۔ گویا میں اپنی ہی ایک خواہش کو پورا کروں گی۔"

میں خاموش تھا۔

"میرا خیال ہے کہ تم میرا مطلب سمجھ گئے" اس نے کہا "جب اور جہاں تم کہو گے میں ٹھیروں گی۔ لیکن جب میری موجودگی کسی طرح بھی تم کو ناگوار گذرے میں فوراً ہی واپس چلی جاؤں گی۔ اور ہمیشہ تم کو ایک ـــــ ایک عزیز ترین دوست سمجھ کر یاد کرتی رہوں گی۔ لیکن تمہارے پاس کبھی نہ آؤں گی جب تک کہ تم مجھے دوبارہ نہ بلاؤ" پھر اس نے ایک غمناک لہجے میں کہا "سلیم! عالمِ اسباب خواہ تم کو مجھ سے کتنی ہی دور پھینک دے۔ لیکن میں ہمیشہ تمہاری اسی طرح خیر خواہ رہوں گی جیسے پہلے تھی یا اب ہوں۔ اور آخر دم تک اگر ممکن ہوا تو تمہاری کسی خدمت سے گریز نہ کروں گی۔ جب اور جہاں طلب کروگے فوراً حاضر ہونگی اور اگر کبھی یہاں تک نوبت پہونچے تو تمہارے ساتھ جان دینے کے لئے بھی تیار رہوں۔"

"چندرا! تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا یہ تمہارے احساسات کی صحیح

ترجمانی ہے۔" میں نے چونک کر کہا۔

"سلیم! تمہیں جان لینا چاہیئے کہ میں تم سے محبّت کرتی ہوں ــــ! تمہاری پرستش کرتی ہوں ــــ!" اس نے اپنی ساری سنجیدگی اور متانت کو ایک دم سے دور کرتے ہوئے کہا۔

خاموش کمرے کی سُنسان تاریکی میں جہاں ہم دونوں کی روحیں ایک دوسرے کو پہچان رہی تھیں میں نے دیوانہ وار اس کی صراحی دار گردن کے گرد اپنا بازو حمائل کیا اور اُس کو اپنے دھڑکتے ہوئے دل کے قریب لاکر اُس کے گلابی، رس بھرے ہونٹوں پر ایک طویل اور خاموش بوسۂ گرم کی مُہر لگا دی!! اُس نے قطعی مُدافعت نہیں کی۔

جیسے ہی میرے گرم اور کانپتے ہوئے ہونٹ اس کے حسین لبوں سے مس ہوئے میں نے اُس کے جسم میں ایک خفیف سا ارتعاش محسوس کیا۔ اُس لمحے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہماری روحیں ایک دوسرے سے معانقہ کر رہی ہیں، اُس کے نرم اور کھلے ہوئے لبوں نے میرے تشنہ جسم میں زندگی کی ایک نئی رُوح پھونک دی۔ اور میرا دماغ خود پسندی اور خود غرضی کے قابلِ نفرت خیالات سے قطعی پاک ہو گیا۔" ایغور اعظم ہمیشہ کے

لئے فوت ہو گیا۔

میں نے اپنی آنکھیں کھولیں چندرا غائب تھی! میں دروازے کی طرف بڑھا اور اُس کو کھلا ہوا پاکر گیلری میں آگیا۔ میری رگ رگ میں مسرور خون لہریں لیتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ میرا دماغ ابھی تک اس نشے میں سرشار تھا۔ بھرے ہوئے بازو کو میں اب تک اپنی گردن کے قریب محسوس کر رہا تھا۔ سڈول اور گدرایا ہوا جسم اب تک میرے سینے کے قریب کانپتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ میں چلا جا رہا تھا۔ یکایک طالبعلموں کا ایک غول زور زور سے باتیں کرتا ہوا میرے قریب سے گذرا۔ میں چونک پڑا — میں دوبارہ اُسی عملی اور خودغرض دُنیا میں تھا۔ امتحانات، کامیابی اور ناکامیابی کے خیالات اُسی طرح سب کے دماغوں پر مسلط تھے اور میں بھی اُنہی میں سے ایک تھا۔ وہ جذبات اور حسیّات کی دُنیا صرف تخییّل کی حد تک محدود تھی۔ میں بھی اپنی دیرینہ متانت اور سنجیدگی لئے ہوئے اوروں سے جا ملا۔

پانچواں باب

امتحان

اُس یادگار شام کے بعد چندرا میرے پاس اکثر آیا کی۔ وہ زیادہ تر اپنے "تحقیق" (RESEARCH) کے کام میں مشغول رہتی تھی اور میں اپنے امتحان کے انتظار میں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اس معانقہ کے بعد چندرا شاید مجھ سے ملنے میں شرمائے لیکن میں نے اُس کے چہرے میں خفیف سی ہراسانی کے آثار بھی نہیں دیکھے۔ وہ اُسی تبسّم کے ساتھ میرے پاس آیا کرتی تھی اور میں اسی خندہ پیشانی سے اُس کا استقبال کیا کرتا تھا۔ وجہ یہ کہ ہم ایک دوسرے کی رُوح کو اچھی طرح شناخت کرنے لگے تھے۔ اور ہمارے "ہم خیال" دماغوں کے اتحاد سے ایک عجیب قسم کا رشتہ ہم دونوں میں قائم ہو گیا تھا۔

امتحان سے ایک ہفتہ پہلے ہندوستانی ڈاک آئی اور میرے نام میرے والد صاحب کا یہ غیر متوقع خط آیا:-

"میاں سلیم!

دُعا۔ مجھے قابل وثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہی کہ تم ایک
ہندوستانی لڑکی کی طرف غیر معمولی طور سے مائل ہو۔
اِس سے پہلے بھی مجھے اس قسم کی اطلاعات موصول
ہوئی تھیں مگر میں خاموش رہا۔ تحقیقات پر یہ معلوم
ہوا کہ چندرا موہنی ریاست رام گڈھ کے حکمران خاندان
سے تعلق رکھتی ہے۔ عنقریب اس کی شادی وہیں کے
کسی کنور سے ہونے والی ہی اور ریاست والے اُس کو بُلا
رہے ہیں۔ لیکن وہ دلیری سے انکار کر رہی ہی۔ تمہیں
جان لینا چاہیئے کہ اگر وہ اسی طرح ریاست کے احکام
کو رد کرتی رہی تو ریاست والوں کو اس بات کا استحقاق
ہے کہ وہ اُس پر کوئی فرد جرم لگادیں۔ ایسی صورت
میں اگر تم نے اس کی مدد کی یا اس کی ہمت افزائی کی
تو تم سخت عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ تمہیں اپنی نہیں
تو کم سے کم ہماری آبرو کا خیال ہونا چاہیئے۔ میں نے
سب کچھ صاف صاف لکھدیا ہی۔ تم اندازہ نہیں کرسکتے
کہ اس ذلیل حرکت کو سُنکر ہم لوگوں کو کتنا صدمہ ہوا۔

تم کو اتنی زیر باری اٹھا کر ولایت بھیجا گیا ہے تو تحصیل
علم کی خاطر نہ کہ "عشق بازی" کے لئے۔ اور ایسی ہی ذلیل
ہندوستانی سے اگر راہ و رسم بڑھائی تھی تو اس کے لئے
یہاں ہندوستان میں بھی بہت سے مواقع ہیں، تمہارے
امتحان میں اب بہت کم دن رہ گئے ہیں اور ہمیں اُمید
ہے کہ ہم کوئی دلخراش خبر نہ سُنیں گے۔
سلیم! یقین ہے کہ تم میرا کہا مان لوگے اور جلد ہی
میں یہ سُن لوں گا کہ تمہارے اور اُس لڑکی کے تعلقات
قطعی منقطع ہو گئے۔ زیادہ دُعا"

"تمہارا ـــــ"

میں دس منٹ تک حواس باختہ کھڑا رہا اور اس خط پر نظر جمائے
رہا۔ اگر دُنیا میں یہ کُلیہ کہ ـــــ اگر کوئی شخص ہمارے محبوب کی
تحقیر یا تضحیک کرے تو ہمارے دل میں اُس کی قدر و منزلت اور
زیادہ بڑھ جاتی ہے" ـــــ کچھ بھی حقیقت رکھتا ہے تو یقین مانیے گا،
میرے دل میں چندرا کی وقعت اور زیادہ بڑھ گئی۔ دوسری بات
یہ کہ میرے والد کا یہ خط اُس وقت موصول ہوا جب کہ پانی سر
سے بلند ہو چکا تھا۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ میرا

چندرا کو چھوڑ دینا قطعی ناممکن تھا، اس خط سے یہ البتہ ضرور معلوم ہو گیا کہ چندرا کسی "ریاست کی غریب رعایا" نہیں بلکہ ریاست رام گڑھ کی کماری ہے۔ میں یہ معلوم کر کے اور بھی خوش تھا۔

دوسرے دن میری آنکھ کھلی تو میرے سر میں سخت درد تھا۔ میری آنکھیں جھلس رہی تھیں۔ بمشکل سے پلنگ سے اٹھ کر صرف کرسی پر بیٹھ سکا۔ اتوار کا دن تھا اور کل سے امتحان شروع ہونے والا تھا، چندرا کی تعطیل تھی اور وہ حسبِ معمول آئی۔ تمام دن وہ میرے قریب بیٹھی رہی اور طرح طرح کے جتن کرتی رہی مگر کسی طرح آرام نہ ہوا۔ میرا سر پھٹا جاتا تھا۔ چندرا نے گرم پانی میں رومال بھگو بھگو کر میرے ماتھے پر رکھنے شروع کیے۔ اور اس سے مجھے قدرے آرام محسوس ہوا۔ تمام دن وہ یہی کرتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرا بھیجا اُبل کر نکل پڑے گا۔ میری آنکھیں سُرخ ہو گئیں تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ چندرا نے کئی مرتبہ مجھے کافی بنا بنا کر پلائی لیکن سوائے اس کے میں نے دن بھر کچھ نہیں کھایا۔ مجھ میں اتنی سکت نہ تھی کہ میں کچھ بول سکوں، کئی مرتبہ میں نے بولنے کا ارادہ کیا لیکن ناکامیاب

رہا۔ کبھی کبھی میں آنکھ کھول کر دیکھتا تو چندرا کو اپنے قریب پاتا۔
وہ بھی خاموش تھی لیکن اُس کا چہرہ حُزن وملال کا مرقع تھا۔
رات ہو گئی اور اب بھی میں نے اس دیوی کو اپنے قریب بیٹھے
دیکھا۔ اُس نے مجھے کئی قسم کے سفوف کھلائے لیکن لاحاصل۔
تمام رات وہ میرے سرہانے بیٹھی رہی صبح ہوتے ہی میرا دردِ
سر آپ ہی آپ یک قلم مفقود ہو گیا اور میں سو گیا، آٹھ بجے
کے قریب چندرا نے مجھے جگایا اور ناشتہ میرے روبرو رکھا۔
میں انتہائی عقیدت مندی میں چندرا سے لپٹ گیا۔ تشکر کے
آنسوؤں نے اُس کا رومال تر کر دیا۔ میری زبان سے صرف یہ
الفاظ نکل سکے "چندرا! تم نے مجھے موہ لیا" اور اس کے جواب
میں میرا کمرہ اس کے مخصوص قہقہوں سے گونج گیا۔ کپڑے
وغیرہ پہن کر میں امتحان والے کمرے میں پہونچا۔ میں نے
اپنے مرغوب ترین مضمون "لاطینی" کے ساتھ اپنی ب اطھر الصاف
کیا۔ دو عدد کاپیاں بھریں۔ بہترین پرچہ کیا۔ کمزوری کی وجہ
سے کہیں کہیں بدخط ہو گیا تھا۔ ورنہ ویسے لاجواب پرچہ کیا
تھا، سب سے آخر میں مسکراتا ہوا باہر نکلا۔ چندرا کے حسین تبسم
نے میرا استقبال کیا۔ "لطف آ گیا" میں نے سیاہی سے بھرا ہوا ہاتھ

اُس کے مخملی ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "چلو، پنچ کھانا چاہیئے، مجھے بڑی زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ تم یہاں تین گھنٹے تک کیا کرتی رہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اوہ! میں سیر کرتی رہی ——— مجھے تمہارا بڑا فکر تھا"
چندرا نے کہا۔

غرض بیس دن تک چندرا برابر اسی طرح میرے ساتھ جاتی اور میرے ساتھ واپس آتی رہی اور میں روز اُس کو اپنے کارنامے سُناتا رہا۔ آخری دن جب میں اور چندرا ایک موٹر میں بیٹھ کر واپس ہوئے تو میں نے اطمینان سے ایک طویل قہقہہ لگایا "یقینی فتح! چندرا!" میں نے کہا "دعوے سے میں فرسٹ ہوں"

چندرا نے ہنستے ہوئے کہا "اچھا تو اب آپ کو کم از کم کچھ عرصہ تک تو اطمینان رہے گا۔ مجھے اس اتوار کو چلا جانا چاہیئے۔ میں چلی تو جاتی اس سے پہلے۔ لیکن میں تمہارے امتحان تک ٹھیر گئی۔ اب مجھے ضرور چلا جانا چاہیئے۔"

"آخر کہاں؟" میں نے دھڑکتے ہوئے دل کو روکتے ہوئے کہا۔

"ونٹر!" اُس نے کہا۔

"کیا تم یہ نہ بتاؤگی کہ تم وہاں کیا کروگی اور کتنے دن تک رہوگی؟"

"میں زیادہ دن نہ ٹھیروں گی، زیادہ سے زیادہ بیس پچیس دن جب تک تمہیں امتحان کا نتیجہ بھی معلوم ہو جائے گا اور" اُس نے ذرا آہستگی سے کہا "جب تک تم کوئی قطعی فیصلہ بھی کر لوگے۔"

اس وقت میں عزت اور محبت کے دو انتہائی مقاصد کو حاصل کر لینا چاہتا تھا۔ میرا دماغ مطلق کام نہ کرتا تھا۔

"کاٹھیاواڑ سے میرے دو عزیز آئے ہیں۔ اُن سے ملنا ہے اور کچھ مسائل طے کرنے ہیں۔"

"کیا میں بھی تمہارے ساتھ نہ چلوں؟" میں نے پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔" چندرا نے پُرزور طریقے پر کہا۔ "میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ تم مجھے خط لکھو۔ کوشش کرو کہ اتنے عرصے تک تم مجھے مطلق یاد نہ کرو۔ امتحان کے طور پر میں دیکھنا چاہتی ہوں اور تم بھی دیکھو، آخر مجھ سے جُدا ہو کر تم پر کیا گذرتی ہے۔ اور پھر جس دن تمہیں نتیجہ معلوم ہو اُسی دن مجھے اس پتہ پر تار دیدینا اور یہ بھی لکھنا کہ اب تمہارا کیا ارادہ ہے۔" کنگز ہوٹل ونٹر"

بس یہ پتہ کافی ہے۔"

"نتیجہ آنے پر میں خود کیوں نہ آجاؤں تمہارے پاس۔" میں نے پوچھا۔

" یقیناً! مگر خبردار جو اس سے پہلے تم آئے یا خط لکھا. وعدہ کرو۔" اُس کی شوخ آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

"میں وعدہ کرتا ہوں۔" اور میں جانتا تھا کہ چندرا ہمیشہ میرا یقین کرتی تھی۔

دو دن بعد چندرا ہمارے اسکوائر سے اپنا تمام اسباب وغیرہ لے کر روانہ ہوئی۔ میں اُس کو "واٹرلو" تک پہونچانے گیا۔ مجھے اُس کے جانے سے بہت رنج ہو رہا تھا۔ "تم مجھ کو بھلا دینے کی کوشش کرنا۔ اور بجائے میرے اپنے نتیجہ پر اور اپنے لائحہ عمل پر غور کرنا۔" چندرا نے اپنی مخروطی اُنگلی ہلاتے ہوئے کہا۔

" عزیزاز جان! میں تم کو ہرگز نہیں بھلا سکتا۔" میں نے جزبز ہوتے ہوئے کہا۔

گاڑی آگئی اور قلی اسباب رکھ کر چلتا ہوا۔ میں بھی گاڑی میں داخل ہو گیا۔ اُس گاڑی میں کوئی دوسرا مسافر نہیں تھا اور

نہ پلیٹ فارم پر زیادہ بھیڑ تھی۔ ہم دونوں کو اس جُدائی کا دُکھ (عارضی تھی) بہت قلق تھا اور اسی افسردگی کے تحت میں نے اپنے بازو اُس کے گرد حمائل کر دئیے اور یہ محسوس کر کے کہ مدافعت نہیں کی جا رہی اپنے ہونٹ اُس کے لبوں سے ملا دئے۔ اُس نے بھی اپنی گداز باہیں میرے شانوں پر رکھدیں۔ اور آنکھیں بند کئے ہوئے ہم دونوں کچھ دیر تک دُنیا وما فیہا سے بے خبر رہے ـــــ انجن کی سیٹی نے حواس بجا کئے اور میں چلتی گاڑی میں سے کودا۔

"گڈ بائی سلیم! اپنی صحت کا خیال رکھنا" چندرا نے سنجیدہ تبسّم کے ساتھ کہا۔

جب تک ٹرین اور اُس میں سے ایک سفید رومال ہلتا ہوا نظر آتا رہا میں پلیٹ فارم پر کھڑا ہاتھ ہلاتا رہا اور بالآخر انتہائی کبیدگی کے عالم میں اپنے سائیں سائیں کرتے ہوئے کمرے میں آ گیا۔

چھٹا باب

کامرانی ـــــ اور ـــــ فیصلہ

چندرا کے چلے جانے کے بعد کالج میں رہنا دوبھر ہو گیا۔ اور تمام لڑکے اپنے اپنے عزیزوں کے پاس چلے گئے تھے صرف میں اکیلا رہ گیا تھا اس لئے میں انتظار کا تکلیف دہ زمانہ گذارنے کے لئے فرانسیسی زبان کے ٹیوٹر مسٹر ڈب کے ساتھ رہنے لگا۔ مجھے کالج کے قابلِ نفرت ماحول کے مقابلہ میں ہر ایک فضا بدرجہا بہتر معلوم ہوتی تھی اور اس لئے میں اُنکے پاس چلا گیا۔ وہ شہر سے بہت دُور رہتے تھے اور کسی قسم کی دلچسپی کے سامان اُن کے ہاں نہیں تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود میں نے اُن کے ہاں رہنا پسند کیا۔ اس لئے کہ مجھے وہاں ہر قسم کی آزادی حاصل تھی۔ چاہے میں رات کبھر باہر رہوں، کوئی پُرسانِ حال نہ تھا۔ اُن کا خاندان بھی کون سا ایسا لمبا چوڑا تھا، لے دے کے صرف تین نفر تھے، ایک مسٹر ڈب خود، ایک اُن کی بیوی اور ایک پانچ برس کا بچہ۔ ایک باورچن تھی،

اور ایک بٹلر بس مسٹر وب تو میرے شروع ہی سے دوست تھے مسز وِب مجھ کو اچھا یوں سمجھتی تھی کہ مجھے اُن کے بچّے سے محبت تھی۔ ذہین اور تیز بچے مجھے ہمیشہ سے اچھے معلوم ہوتے ہیں اور ولیم نہایت ہی سمجھ دار اور شوخ بچہ تھا۔ میرا تمام وقت اُسی کے ساتھ کھیلنے میں صرف ہوتا تھا۔ بعض اوقات جب میں کسی گہرے تفکر میں غرق ہوتا تو ولیم آکر پیچھے سے میرے سر پر پانی ڈال دیتا۔ میرا تمام فکر رفو چکر ہو جاتا اور میں پھر اُس کے ساتھ کھیل میں مشغول ہو جاتا۔ دن بھر یہی ہوتا رہتا البتہ راتیں میری انتہائی پریشانی اور تردد کے عالم میں گذرتیں۔ اپنے تمام احساسات کو قطعی طور سے فراموش کئے ہوئے میں ایک بے خودی کے عالم میں رات رات بھر چمن میں بیٹھا غالبؔ جوشؔ اور جگرؔ کی غزلیں گایا کرتا۔ کبھی میں کافوری شمع کی روشنی میں چندرا کے نام لمبے چوڑے خط لکھا کرتا۔ یہ جانتے ہوئے کہ میں اُس کو یہ خط بھیج نہیں سکتا تھا۔ لیکن محض دل بہلانے کے لئے لکھا کرتا اور خود ہی پڑھکر چاک کر دیتا۔

مجھے پروفیسر وِب کے ساتھ رہتے ہوئے پورے پانچ ہفتے گذر چکے تھے اور کبھی میرا دل نہیں گھبرایا تھا۔ لیکن چندرا کا خیال مجھے

ہر وقت ستا تا رہتا تھا۔ اُس کا دل نشین چہرہ ہر وقت میرے سامنے رہتا تھا۔ ایک دن میں نے ایک بجے لنچ کھایا اور اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میرا جی کچھ پڑھنے کو چاہا اور میں نے اپنے پلنگ کے نیچے رکھے ہوئے کتابوں کے بکس کی تلاشی شروع کی، کوئی کتاب ڈھنگ کی نظر نہ آئی۔ ایک کتاب نکالتا اور پھینک دیتا، دوسری نکالتا اور پٹخ دیتا۔ اسی سٹر پٹر میں تھا کہ کسی نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ بٹلر نے میرے ہاتھ میں ایک تار دیا اور کچھ کہا جو میں سُن نہ سکا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے میں کھڑکی کے قریب گیا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا اور دماغ چکرا رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا اس تار میں کیا ہے۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ جس چیز کا خیال آپ کے دماغ میں دن رات ہر وقت مسلّط رہے وہ عام طور سے ایسے وقت میں ظہور پذیر ہوتی ہے جب کہ آپ کو اُس کا مطلق خیال نہ ہو، میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا۔

"فرسٹ پاس ——— دلی مبارکباد ——— "رے ٹ"!"

واللہ! پہلے لمحے میں مبہوت تھا، دوسرے لمحے پاگل، تیسرے لمحے مجنوں، چوتھے لمحے مدت کا مریض اور پانچویں لمحے کھڑکی کے

پاس بے ہوش!!! میں نہیں کہہ سکتا کہ کتنی دیر تک بے ہوش رہا جب
آنکھ کھلی تو میرے سر میں درد تھا۔ اور شدید پیاس لگ رہی تھی۔
میرے کمرے میں پانی کا نام نہیں تھا البتہ تھوڑا سا پانی منہ دھونے
کے تسلے میں پڑا تھا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور وہی پانی پی لیا۔
اس میں صابن کی بو تھی مگر خیر ——— "فرسٹ پاس!" میں بالکل
آزاد تھا۔ مجھے فوراً ہی چندرا کے پاس پہونچنا چاہیئے۔

میں نے اپنا "گلیڈ اسٹون بیگ" کھولا اور اس میں ضرورت
کی چیزیں بھرنی شروع کیں۔ کچھ بڑھیا قسم کے کپڑے رکھے۔ کاغذ
قلم دوات، دو لیونڈر ٹائیاں، بالوں کے برش۔ حجامت کا سامان
اور ایک سلیپر ——— دوسرا مجھے ملا نہیں اور ڈھونڈھنے کے لئے
میں ٹھہر نہیں سکتا تھا ——— مارا مار سب کچھ ٹھونس ٹھانس
میں نے بیگ بند کیا۔ کوٹ کی جیب میں صرف تین "سادرین" تھے
اور تھوڑے سے تانبے اور چاندی کے سکے۔ "بہت کافی!" میں
نے کہا اور "فرسٹ پاس" کمرے کی دیواروں نے جواب دیا۔ کمرے
کی تمام چیزوں کو میں نے اسی طرح پڑا رہنے دیا۔ کتابیں کپڑے
بکس، ٹرنک، سب ایک بے نظمی کی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔
میں نے بیگ اٹھایا۔ تار کو احتیاط سے جیب میں رکھا اور نیچے

اُترا ۔ اس بے ادب نائی میں تمام چیزیں مجھے بیرتی نظر آرہی تھیں۔

میں نے پروفیسر وتب کے ہاتھ میں تار دیتے ہوئے کہا "مجھے مبارک باد دیجئے"! مسز وتب تار پر جھک گئیں، اور کھلی ہوئی باچھوں سے انہوں نے میری پیشانی پر بوسہ دیا۔ پروفیسر وتب نے مجھ سے انتہائی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ وتیم دوڑتا ہوا آیا اور میں نے اُسے گود میں لے کر خوب گدگدایا۔ اُس نے میرے کوٹ کا ایک بٹن توڑ لیا۔ پروفیسر وتب سے اجازت لے کر ہوا کی طرح دوڑتا ہوا سڑک پر آیا اور ٹیکسی کر اسٹیشن پر پہونچا۔ چندرا کے پاس جانا جولائی کے مہینے میں اور اس تار کو لے کر کتنا خوشگوار تھا۔

جب میں اسٹیشن پہونچا تو ٹرین جانے ہی والی تھی۔ مجھے پیاس لگ رہی تھی اور میں نے ایک پگ پینا چاہا۔ لیکن صرف دو منٹ باقی تھے اور میں نے چندرا کو تار دینا بہ نسبت پگ پینے کے زیادہ ضروری سمجھا۔ میرے بیگ کو ایک درجے میں پھینک دیا گیا اور اُسی کے ساتھ میں بھی در آیا۔

تیز اور چمکدار دھوپ ٹرین کی کھڑکیوں میں سے چھن چھن کر گدیلوں پر پڑ رہی تھی۔ پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے تمام لوگ مجھے غور سے دیکھ رہے تھے اور ہر شخص "فرسٹ پاس" کہتا ہوا معلوم

ہوتا تھا۔ میں نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور جیسے ہی کہ ٹرین روانہ ہوئی میں کھڑکی سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا ـــــ چندرا نے کہا تھا کہ اس عرصہ میں مجھے اپنے آئندہ لائحہ عمل کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ کرلینا چاہیئے۔ مگر یہ وقت تو فیصلہ کرنے کا نہیں ہے۔ بے پایاں مسرت کی اولین گھڑیوں کو مجھے پوری خوشی کے ساتھ بسر کرنا چاہیئے۔ اگر انسان کا دماغ ہر وقت کسی نہ کسی منحوس گتھی کے سلجھانے میں مصروف رہے تو اس کی زندگی یقیناً اجیرن ہو جائے۔

میں اپنے ہندوستان جانے کا ایک خوبصورت اور دلآویز خواب دیکھنے لگا۔ عزیزوں اور دوستوں کی تعریف کے پل ـ والدین کی حقیقی مسرت ـــــ پُر تکلّف دعوتیں ـــــ نغمہ و سرود کی رنگیلی محفلیں ـــــ باوقار عہدہ ـــــ فارغ البالی ـــــ لیکن ان سب میں، میں چندرا عزیز چندرا کو ہمیشہ اپنے پہلو میں پاتا تھا۔ ـــــ "چش!" میں نے کہا۔ "ان دونوں میں سے صرف ایک چیز حاصل ہو سکتی ہے!!!"

ٹھیک چھ بجے ٹرین "ونٹر" پہونچی۔ پلیٹ فارم پر میں نے چندرا کو دیکھا۔ کو دکر میں ٹرین سے باہر تھا اور دوسرے لمحے چندرا

میرے آغوش میں تھی اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔"فرسٹ" اور میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ انتہائی خوشی میں میں بالکل حواس باختہ ہو رہا تھا اور میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔

"میں بہت خوش ہوئی سلیم! مجھے یقین تھا کہ تم ضرور فرسٹ آؤ گے"۔ اُس نے ایک شگفتہ تبسم کے ساتھ کہا۔"یہ تمہارا بیگ ہے؟"

ہم اسٹیشن کے باہر آئے۔ کتنی حسین شام تھی۔ بلنے ہیبتناک سمندر پر موجیں مار رہا تھا خنک اور رُوح پرور ہوا کے جھونکے رنگین شفق۔ چندرا کا نرم و گرم ہاتھ میرے شانہ پر۔ "فرسٹ پلس" کا تار میری جیب میں ـــــ یقیناً میں کسی دوسری دُنیا میں تھا۔

"چندرا! تمہاری یاد میں تڑپتا رہا۔ خدا ہی جانتا ہے تمہارے بغیر میں نے اتنے دن کس طرح گذارے"!

"تمہیں کب معلوم ہوا ـــــ؟"

"ایک بجے دن کو"

جب ہم ہوٹل کے قریب پہونچے تو چندرا نے کہا "مسٹر شنکر ایک ہفتہ کے لئے لندن گئے ہوئے ہیں اور اب تیسرے

دن واپس آجائیں گے۔ مجھے جب تمہارا تار ملا تو میں نے فوراً تمہارے لئے ایک کمرہ اپنے کمرے کے برابر مخصوص کروالیا۔ اس لئے کہ مجھے یقین تھا کہ تم کم از کم دو دن تو ضرور ٹھہرو گے، اور جب تک ہمیں ایک نہ ایک فیصلہ ضرور کرلینا چاہیئے۔ مسٹر شنکر مجھے اگلے مہینہ کی ۲۷ تاریخ کو اپنے ہمراہ ہندوستان لیجانا چاہتے ہیں"۔

میں نے چندرا کے بازو کو زیادہ زور سے پکڑ لیا" کیا تم کچھ کھانا پسند نہ کرو گی؟ میرے خیال میں اس وقت کافی مزا دے جائے گی"۔

اُس نے برآمدے میں کافی لانے کا حکم دیا اور خود برآمدے میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی میں بھی اُس کے مقابل کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں اُس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا اور "فرسٹ پاس" کا تار میرے جسم میں گرمی پہونچا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ زندگی واقعی نعمت ہے۔

سقف شگاف قہقہوں اور دلچسپ فقروں کے درمیان کافی ختم کی گئی۔ چندرا ایک دلدوز مسکراہٹ کے ساتھ برآمدے کے کٹہرے سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ میں بھی ایک سگار سلگا کر اُس کے قریب آکھڑا ہوا۔ اُس کی نظریں دُور اُفق پر جمی ہوئی تھیں۔

اور میں اُس کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ حُسن کا اتنے قریب سے نظارہ کرنا ایک ہیجانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔۔۔ وہ یقیناً بلا کی حسین تھی۔ اُس کا ناک نقشہ، قد و قامت، چال ڈھال، نشست و برخاست سب حسین تھے۔ لیکن اس جسمانی حُسن کے علاوہ ایک اور چیز تھی جو سب سے زیادہ اثر رکھتی تھی۔ وہ اُس کی پاک شخصیت تھی، اُس کی نیک سرشت تھی، اُس کی کیفیتِ دماغ تھی اور یہی چیزیں ایسی تھیں جنہوں نے مجھے عرصہ سے اپنا بنا لیا تھا۔

میں اُس کی طرف دیکھ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے دل سے تعش کے جذبات رفتہ رفتہ غائب ہو رہے ہیں اور اُن کی جگہ ایک مبہم سی تمنا اور ایک غیر معلوم سی آرزو پیدا ہو رہی ہے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس دیوی کا غلام بن کر رہوں، اُس کا چاکر بن جاؤں اور ہر قسم کی قربانی کر کے اس انوپ شخصیت کی خدمت کروں۔ یکایک چندرا نے حرکت کی اور میری سرد اور "خود پرست" فطرت جاگ اٹھی۔ میرا دل تڑپ تڑپ کر اُس پر نثار ہونے لگا۔ اس مبہم اور کُہر سے بھرے ہوئے خیالات کے جھرمٹ میں پہلی سنجیدہ بات جو مجھے سوجھی وہ یہ تھی۔ اگر اُس کے مفاد کے لئے میں اُسے چھوڑ دوں تو۔۔۔؟

لیکن ذرا چندرا کے خیالات بھی تو معلوم کرنے چاہئیے ہیں۔
"چندرا فرض کرو میں تم کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہنے آیا ہوں؟"
وہ جلدی سے مڑی، اُس کا چہرہ یکایک درد و کرب کا مرقع بن گیا۔ اور میں اپنی فتحمندی پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اُس نے کہا:۔

"مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر ہمارے تعلقات فی الفور منقطع ہو جائیں تو یہ تمہارے لئے بہت سود مند ثابت ہوگا۔ تم فوراً ہندوستان جا سکو گے اور یہ تمہارے لئے بہت ضروری ہے۔"
میں نے مسکراتے ہوئے اس کے گرد اپنا بازو حمائل کیا اور اس کو اپنے قریب لا کر اُس کی سیاہ شوخ آنکھوں میں اپنی ہنستی ہوئی آنکھیں ڈالدیں اور کہا:۔

"اور فرض کرو کہ ہم دونوں اپنے اپنے آئندہ اعزاز کو ٹھکرا دیں اور ابدالآباد تک ایک دوسرے کی تقدیر کے ساتھی رہیں۔"
"ہرگز نہیں، سلیم! تم اپنے آپ کو تباہ کر دو گے اس خیال کو چھوڑ دو اپنے پاؤں پر خود کیوں کلہاڑی مارتے ہو۔ میرا خیال تھا کہ تم اتنے عرصہ میں خوب اچھی طرح سوچ کر اس ارادے سے باز آؤ گے اور سب کچھ فراموش کر دو گے....."

"لیکن دیکھو میں نے تو کچھ بھی فراموش نہیں کیا"! میں نے اُسی فیلسوفانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ایک عرصہ تک ہم دونوں خاموش رہے۔ ڈنر کا وقت ہو گیا اور سب لوگ نیچے ہال میں چلے گئے۔ ہم بھی گئے۔ ڈنر کے بعد کوئی مفید مطلب گفتگو نہیں ہوئی۔ واپسی پر چندرا نے کہا:-

"اب گیارہ بجے ہیں۔ ہمیں زیادہ دیر تک جاگنا نہ چاہیئے"۔ اور ایک "گڈ نائٹ" کے ساتھ وہ رخصت ہو گئی۔ اور میں بھی اپنے کمرے میں آ گیا۔ خاموش تاریکی میں بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ دو زندگیوں کا فیصلہ میرے ہاتھ میں تھا۔ گیارہ بجے۔ بارہ بجے اور ایک بج گیا اور میں اُسی طرح بیٹھا رہا جیسے کہ اکثر امتحان کے زمانے میں بیٹھا کام کیا کرتا تھا۔ میں اُٹھا اپنے تاریک کمرے سے باہر نکلا۔ گیلری میں سے ہوتا ہوا چندرا کے کمرے کی طرف چلا۔ اگر کوئی اور عورت ہوتی تو میں رات کے ایسے خطرناک وقت میں کبھی اس کی تلاش نہ کرتا لیکن چندرا اور میرے درمیان مکمل آزادی تھی اور اُسی کے برابر مکمل معصومیت، میں جانتا تھا کہ چندرا کو میری موجودگی کسی وقت بھی ناگوار نہیں گذرتی۔ اُس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوا، ایک وسیع کمرہ تھا۔ کھڑکی بھی کھلی ہوئی تھی۔

اور کھڑکی کے قریب ایک عمدہ مسہری بچھی ہوئی تھی مسہری کے برابر ایک چھوٹی سی میز رکھی ہوئی تھی اور اس پر ایک بڑا لیمپ روشن تھا۔ مگر بتی نیچی تھی۔ اس کے علاوہ چندرا کے خوبصورت آویزے، چھلے انگوٹھیاں اور وہی تاریخی طلائی گھڑی اور بروچ تمام اسی میز پر پڑے ہوئے تھے۔ لاپروائی اور معمولی باتوں میں ناعاقبت اندیشی اُس کے کردار کی نمایاں خصوصیت تھی۔ مسہری پر شفاف چادر بچھی ہوئی تھی۔ اور اس پر چندرا حسین چندرا محوِ خواب تھی۔ ایک دلفریز انداز میں وہ چت لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کے گدرائے ہوئے بازو سر کے اوپر تھے۔ بلاؤز مسک کر اس کے بلوری سینہ کی نمائش کر رہا تھا۔ اس کی گرم اور شفاف، مائل بہ صندلی جلد کتنی چمک رہی تھی۔ اُس کا سینہ سانس لینے سے کتنے حسین اور لطیف انداز میں اُبھرتا تھا اور پھر دب جاتا تھا۔ پھر اُبھرتا تھا اور پھر دب جاتا تھا۔ اُس کا سر تکیہ میں دھنسا ہوا تھا۔ اور سیاہ ریشمیں بالوں نے اُس کے رخساروں کے گرد ہالہ کر رکھا تھا۔ اُس کی باریک ابروؤں کی کمانیں ــــ اُس کے متبسم لب، اُس کا آسمانی سراپا۔ کاش میں مصور ہوتا! اس کے اس انداز کو، اُس کے باوقار طریقہ خواب کو اُسکے حسین چہرے کے "سکوتِ گویا" کو اپنے موقلم سے جاوداں بنا دیتا۔

دُنیا میں وہ ایک ہستی جس کو میں سب سے زیادہ عزیز رکھتا تھا، اس وقت میرے رُوبرو تھی۔ کیا میں ہمیشہ کے لئے اس کو خیرباد کہدوں ——؟ مستقبل کی دو تصویریں میرے سامنے تھیں۔ ایک طرف ہندوستان کی واپسی، عہدہ، شہرت، اعزاز، دولت کی فراوانی، اقربا کی خوشی اور ترقی کی وہ شاہراہ جس پر کامزن ہونے کے لئے میں ہمیشہ سے تڑپتا تھا۔ دوسری طرف گمنامی، غریبی اور کشاکش کی تاریک زندگی، عزیزوں کی ناراضگی، میری برسوں کی محنت کی خجلت —— چندرا سے جُدا ہو کر عزت، دولت، شہرت اور غریبوں کے لئے باعثِ فخر اور —— چندرا کے ساتھ رہ کر گمنامی، نفرین، غربت، بدنامی، بے عزتی —— دونوں میں کون سا ——؟

میں مسہری کے قریب کھڑا تھا اور میرے دونوں ہاتھ میرے سینہ پر تھے جس میں اندوہ کا ایک طوفان موجزن تھا۔ اور چندرا جوانی کی سرشار نیند میں غلطاں تھی۔ وہ ہر قسم کی تکلیف اور تفکر سے آزاد تھی۔ کاش میں ایک نظر اپنے مستقبل کو دیکھ سکتا لیکن ناممکن! ہم سب کو اس دُنیا میں تمام فیصلے اندھا دُھند کرنے پڑتے ہیں۔ میری نگاہیں اچانک ایک چھوٹے سے قیمتی قالین پر پڑیں، اس کی

نوک یقیناً تیز ہوگی۔ ایک حل! اس کو اُٹھا کر چندرا کے نرم سینے میں پیوست کر دینا اور پھر اپنے دل میں گاڑ دینا کتنا آسان ہے! اُسکے اپنے خون کو ملا دینا اور ایک دوسرے کے آخری سانسوں کو اپنے لبوں میں جذب کر لینا اور ایک دوسرے کے بازوؤں میں مرجانا! آخر کیوں نہیں ــــ؟ جو لوگ خدا کے پیارے ہوتے ہیں وہ جلد ہی مرجاتے ہیں۔ اور میں نے تو ابھی سے زندگی کی مضحکہ خیز بوقلمونی کو محسوس کر لیا ہے۔ میں نے کامیابی دیکھی اور کامرانی کو چکھا لیکن اُس کو قطعی بے مزہ پایا۔ یقیناً یہ ارادہ بہترین تھا۔ ایک لمحے بے پایاں مسرت اور دوسرے لمحے ایک دوسرے کی آغوش میں ابدی نیند سو جانا زندگی کی ہزاروں رنگا رنگیوں، سینکڑوں متزلزل نشیب و فراز سے بدرجہا بہتر تھا۔

میں مسہری سے ہٹ کر کھڑکی کے قریب آ کھڑا ہوا اور سل کے اُوپر کہنیاں ٹکا کر گہرے نیلے رنگ کے آسمان کو دیکھنے لگا۔ اس دماغی کرب اور تذبذب نے میرے حواس پراگندہ کر رکھے تھے۔

اُف! وہ رات بھی کتنی غضبناک تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنی تمام زندگی میں میں نے جتنے گناہ کیے اُن سب کا اجر مجھے اسی رات ملا۔ پھر ایک دم سے تمام تکلیف تمام غیر اطمینانی حالت رفع ہوگئی۔

میں نے فیصلہ کرلیا ـــــ!!!

فطرت کے تحائف کو قبول کرو۔ ایک دفعہ ہمت کرجاؤ اور پھر تمام زندگی عیش کرو۔ میں اُٹھا۔ ایک غرور اور ایک تمکنت کے ساتھ میں فیصلہ کرچکا تھا۔ ساری دُنیا ایک طرف اور چندرا ایک طرف۔ خاموشی سے میں نے ایک کاغذ کا پرزہ لیا اور اُس پر گجراتی میں لکھا "میں نے قطعی فیصلہ کرلیا۔ ہم دونوں ابد تک ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہیں" میں نے اپنا چھلّہ اُتارا ـــ مابیات کی قسم سے صرف یہی ہیرے کا چھلا میرے پاس تھا ـــــ اور اُس میں وہ پرزہ پروکر میز پر رکھ دیا۔ اُس کے زیورات میں سے میں نے ایک سادہ سا چھلّہ منتخب کیا اور اُس کو پہن لیا۔ رات قریب قریب ختم ہوچکی تھی۔ میں نے ایک مرتبہ اور حسین چندرا کی طرف دیکھا۔ زیادہ تر اس وجہ سے کہ یہ نقشہ، یہ انداز، یہ سراپا ہمیشہ تک میرے دماغ میں محفوظ رہے، اور کمرے سے چلا آیا۔ نہ میرے دل میں افسوس تھا نہ رنج۔ میں اپنے فیصلہ پر پچھتاتا تھا......

.... ورنہ میں اپنے تاریک مستقبل سے ڈر رہا تھا۔ جو ہو سو ہو میں فیصلہ کرچکا اور اب مردانہ وار اُس پر قائم رہوں گا۔

میں اپنے کمرے میں آیا اور صبح صادق کی چمپئی روشنی میں خط لکھنے بیٹھ گیا۔ ایک اپنے والد صاحب کو لکھا، ایک اپنے بھائی کو اور ایک، ایک دوست کو۔ والد کو نہایت ہی مختصر الفاظ میں بغیر دلائل کے یہی لکھ دیا کہ مجھے افسوس ہے میں انڈین سول سروس میں داخل نہیں ہو سکتا اور کچھ عرصہ یہیں رہوں گا۔ بھائی کو واقعات سے تھوڑا بہت آگاہ کیا اور یہ لکھا کہ والد کے غصے کو ذرا کم کرنے کی کوشش کرنا۔ تیسرا خط عثمان ایک میرا ہم جماعت تھا جو آج کل ٹرکی میں ہے اُسے لکھا۔ وہ حضرت خدا معلوم کس طرح گرتے پڑتے اسسٹنٹ کونسل بن بیٹھے۔ ہندوستان سے روانگی کے وقت اُنہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر تم آئی سی۔ ایس میں فیل ہو جاؤ تو مجھے لکھنا میں قسطنطنیہ میں تمہارے لئے کوشش کروں گا۔ میں نے اُن کو یہی جتایا کہ میں بدقسمتی سے فیل ہو گیا اور اب مجھے نوکری دلواؤ۔

جب میں یہ خط لکھ چکا تو میں ایک تبسم کے ساتھ غور کرنے لگا، کل تک آئی سی۔ ایس میرے لئے ہر ایک چیز تھی۔ میں نے اپنے عیش و آرام کو ٹھکرا کر اپنی صحت پر لات مار کر اس کو حاصل کیا تھا اور اب جبکہ میں نے اُس کو حاصل کر لیا، میں اوّل آ گیا تو اب یہ سوچ رہا ہوں کہ

اس بلا سے کس طرح جلد از جلد نجات حاصل کروں! بہر حال! میں خوش تھا۔

ناشتہ کے وقت میں نے دیکھا چندرا میرا چھلا پہنے ہوئے تھی۔ بغیر میرے کچھ کہے ہوئے چندرا نے کہا "میں مسٹر شنکر سے فی الحال یہی کہوں گی کہ میں ابھی کچھ اور پڑھوں گی اور یہ کہ میرا ارادہ ایک ڈپلوما اور لینے کا ہے۔ جب وہ ہندوستان واپس چلے جائیں گے تو بس پھر ہم آزاد ہیں۔ جہاں جی چاہے وہاں چلنا۔ بالآخر میں لوگوں کو یہ جتا دوں گی کہ میرا ارادہ یہیں پریکٹس کرنے کا ہے، اور ہندوستان آنے کا نہیں"۔

ایک مرتبہ اور میرے مرتعش لب اس کے حسین لبوں پر تھے۔

میں اس سے اجازت لے کر پروفیسر وتب کے ہاں روانہ ہوا۔
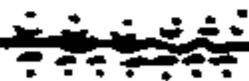
ساتواں باب

دَورِ جدید

میں اُسی سہ پہر کو مسٹر وتب کے ہاں واپس آگیا۔ خطوط کا ایک انبار میرے لئے موجود تھا۔ تمام دوستوں اور عزیزوں نے مبارکباد کا ڈھیر لگادیا تھا۔ میں نے ایک ایک کرکے سب کو پڑھا۔ جب ختم کرچکا تو میں کرسی کی پشت سے سر لگا کر غور کرنے لگا۔ اچانک میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے اپنے پرنسپل ڈاکٹر ریے کو دور سے آتا ہوا دیکھا۔ دوڑ کر میں پہونچ گیا اور ہال کا دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھتے ہی ڈاکٹر ریے نے انتہائی گرمجوشی سے مجھے تقریباً گلے لگا لیا۔

"تم نے کمال کر دیا سلیم! مجھے تم سے ایسی ہی اُمید تھی۔ تم کالج کے لئے باعث فخر ہو۔ میں تم کو مبارکباد دیتا ہوں۔ ریکارڈ بیٹ کر دیا۔ تم نے فہرست تو نہ دیکھی ہو گی۔ میں لیتا آیا ہوں۔" اب تک ہم ڈرائینگ روم میں آ چکے تھے۔ "یہ دیکھو! ایس۔ ایم۔ سلیم ۹۵٪ ریز کالج" "میں تم سے بہت خوش ہوں۔ تم نے کالج کا نام روشن کیا۔"

میں ہنسا اور کہا۔ "میں اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ آپ کو میری کامیابی سے اس درجہ خوشی ہوئی۔"

"سلیم! تم ضرور صاحب اقبال ہو۔ تمہاری ذہانت، جفاکشی اور قابلیت تم کو ایک نہ ایک دن اپنے صوبہ کا گورنر بنا کر رہے گی!"

میں نے قہقہہ لگایا۔

"یونانی زبان کے پرچے نے بہت سوں کو اڑا دیا۔ تم نے ضرور پلیٹو کو اچھی طرح پڑھا ہوگا۔"

"جی ہاں! واقعی میری کامیابی کا دارومدار یونانی اور لاطینی ہی پر تھا۔ پلیٹو کو تو میں نے قریب قریب ہضم کر لیا تھا۔"

"اچھا! لو یہ حقیر رقم ہر اس طالب علم کو میں اپنے پاس سے دیتا ہوں جو ہمارے کالج سے غیر معمولی عزت کے ساتھ کامیابی حاصل کرے۔" اور یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنی نوٹ بک میں سے ڈیڑھ سو پونڈ کا چیک نکالا ــــــ اور یقین مانئے آج تک یہ رقم تم سے زیادہ مستحق طالب علم نے نہیں لی۔ اور نہ اس سے پہلے میں نے اس کو دینے میں اتنی مسرت محسوس کی!"

میں جانتا تھا کہ اس قسم کے عطیہ دینا ڈاکٹر ریے کا ہمیشہ سے دستور تھا۔ اس لئے میں نے بہت سے شکریوں کے ساتھ وہ چیک

بخوشی قبول کیا اور ان کی دعوتِ طعام بھی جو آج ہی شام کو تھی۔
دوسرے دن مجھے اپنے والد کا مبارک بادی کا تار ملا۔ مجھے اُس سے روحانی تکلیف پہونچی اور باقی ماندہ وقت اور ساری رات اِسی تردد میں گذر گئی کہ جب والد کو میرا خط ملے گا تو اِن کو کیا رنج نہ ہوگا۔ خیر، یہ بھی ایک وقتی چیز تھی، دوسرے دن وہی میں تھا اور وہی چندرا کا خیال، اکثر اُس کے پاس سے خط آیا کرتے تھے۔ مسٹر شنکر کے قیام کے دن بھی آخر کار کسی نہ کسی طرح گذر گئے اور ایک دن چندرا کا ایک پرچہ آیا جس میں لکھا تھا کہ شام کو ۵-۵۵ پر ٹلبری ڈاک سے مسٹر شنکر کا جہاز روانہ ہو جائیگا اور یہ کہ اُسی شام کے بعد سے چندرا ہمیشہ کے لئے میری ہے۔
میں نے اپنا تمام سامان باندھا اور بالکل تیار ہو گیا۔ شام کو میں بھی ٹلبری ڈوک گیا۔ میں اس جگہ کے چپّے چپّے سے واقف تھا۔ اِس لئے کہ یہیں سے ہندوستان جانے والے جہاز روانہ ہوتے تھے۔ میں اسٹیشن کے باہر کھڑا چندرا کا انتظار کرتا رہا۔ کوئی بیس منٹ کے بعد وہ نمودار ہوئی۔ اُس کا چہرہ بشاش تھا۔ مسرّت کی ایک برقی رو اس میں سرایت کی ہوئی تھی۔ ایک حسین قہقہہ کے ساتھ اُس نے میرا استقبال کیا۔ "سلیم! اب میں ہمیشہ کے لئے

تمہاری ہوں اور آزاد ـــــ آزاد!"

"اب ہمیں اپنی رہائش کا کوئی بندوبست کرنا چاہیئے" میں نے اپنے قہقہہ کو روکتے ہوئے کہا۔

"ہمیں فوراً ہی کسی نہ کسی ہوٹل میں چلا جانا چاہیئے۔ میں مسٹر شنکر والے کمروں سے تنگ آ گئی ہوں" اُس نے کہا۔

ہم ٹرین میں بیٹھ کر فن چرچ اسٹریٹ پہنچے اور وہاں سے سیدھے نیو ہوٹل، جو ٹرا فلگار اسکوائر کے بالکل قریب ہے۔ چندرا نے طویل خاموشی کو توڑا اور کہا "بڑی مشکل سے اپنا پیچھا چھڑایا ہے۔ مسٹر شنکر مجھے زبردستی لے جا رہے تھے لیکن میں بھی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اُن کو یہی بتایا ہے کہ میں ابھی چھ سات ماہ اور ریسرچ (تحقیق) کروں گی اور اتنے عرصہ تک میرا وظیفہ برابر آتا رہے گا" جیسے ہی کہ اس کا فقرہ ختم ہوا میں نے اُس کے خوبصورت اور گداز ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیکر تیسری انگلی میں ایک خوبصورت انگوٹھی پہنا دی۔ اس نے میری طرف پر معنی نظروں سے دیکھا اور اُس کی شوخ آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

ہوٹل میں ہم نے ایک بہت بڑا کمرہ مخصوص کروا لیا اور ڈنر کے بعد چندرا کے اصرار پر ہم دونوں اوپرا (تھیٹر) گئے۔ وہاں سے

واپسی پر رات کا بقیہ حصہ ہم نے ایک دوسرے کے آغوش میں گذار دیا۔ اور اس طرح گویا ہم دونوں کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ دوسرے دن علی الصباح میں پروفیسر وتب کے ہاں اپنا سامان اور خط وغیرہ لینے گیا۔ میرے نام صرف دو خط تھے اُن میں سے ایک ترکستان سے آیا تھا۔ واپسی پر میں نے اُسے پڑھا "اگر میں فوراً ہی آسکتا ہوں، اور اگر میں ترکی بول چال کا ماہر ہوں (میں نہیں تھا) تو مجھے ۲۵۰ پونڈ سالانہ کی جگہ مل سکتی ہے"۔ میں خوب ہنسا۔ عثمان کو میرے فیل ہو جانے پر بہت افسوس تھا۔ اُس کو اُمید تھی کہ کچھ عرصہ بعد وہ مجھے اس سے بہتر نوکری دلوا سکے گا۔ آخر میں، وہ میری ہر طرح مدد کرنیکے لئے تیار تھا۔ میں نے خط کو جیب میں رکھا اور پھر میرے اوپر سوفسطائی سنجیدگی طاری ہو گئی۔ "ہم کو مسرت اور آسودگی حاصل کرنے کے لئے کتنی بڑی قربانیاں کرنی پڑتی ہیں"۔ میں نے دل میں کہا۔ اور یہ سب کچھ مجھے چندرا کے حاصل کرنے کے لئے کرنا پڑا۔ مجھے چندرا سے عشق تھا۔ لیکن کیسا عشق؟ ایسا عشق نہیں جو ایک معمولی مرد اور ایک معمولی عورت میں ہوتا ہے جس کی بنیاد محض سیدھے سادے اور فطرت کے عین مطابق جذباتِ حیوانی پر ہوتی ہے بلکہ ایسا عشق جو

فطرت کے عین مخالف تھا جس کی جڑ بنیاد ایک دوسرے کی توجہ اور ایک دوسرے کے ہم خیال دماغ پر تھی اور اسی وجہ سے یہ اوّل الذکر سے زیادہ مستحکم اور زیادہ پُر اثر تھا۔ چندرا کا تصور ہی میرے دل و دماغ میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا کر دیتا تھا اور اس کی موجودگی میں تو میرے دماغ پر ایک کیف و سکر کا عالم طاری رہتا تھا۔

اپنا اسباب وغیرہ رکھوا کر میں نے چندرا کو تلاش کیا۔ وہ ہوٹل کی لائبریری میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی "کوئی خط آیا؟" اس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

"ہاں! اور قسطنطنیہ سے" میں نے جواب دیا اور وہ خط اس کے ہاتھ میں دیدیا۔ اس نے وہ خط پڑھا اور بولی:۔

"اتنی تنخواہ تو تمہیں یہاں بھی مل سکتی ہے۔ کیا ارادہ ہے سلیم!"

"لیکن پھر بھی قسطنطنیہ انگلستان سے تو بہر حال بہتر ہوگا — میں تو یقیناً جانا پسند کروں گا لیکن تصفیہ تمہارے ہاتھ ہے" میں نے کہا۔

"بس تو جہاں تم خوش وہاں میں خوش۔ تمہاری راحت میری عین راحت ہے"

"فنڈ کے متعلق یہ ہے کہ میرے پاس فی الحال ڈاکٹر ریس کے دئے ہوئے ۵۰ پونڈ اور روال ڈ کے پاس سے آئے ہوئے ۱۰۰ پونڈ ہیں بس ان کے علاوہ اس دنیا میں میرے پاس کچھ نہیں۔"

"فنڈ کا تم اتنا زیادہ فکر نہ کرو، جب تک میں یہاں ہوں میرا وظیفہ برابر آتا رہیگا۔ ۸۰ پونڈ ماہانہ بہت کافی ہوں گے۔" اُس نے تشفی بخش لہجہ میں کہا۔

اسّی پونڈ ماہانہ! میں چونک گیا۔ یہ تو ایک مستقل دولت ہے اور چندرا اس خزانہ کو چھوڑ کر مجھ غریب کے پاس آ رہی ہے اور اس کے عوض میں اُسے کیا دے سکوں گا سوائے ۲۵۰ پونڈ سالانہ کے میرے پاس کیا دھرا تھا اور وہ بھی ابھی تک طے نہیں ہوا تھا۔

"مگر چندرا! ۲۵۰ پونڈ سالانہ بھی کوئی رقم ہے، میں آخر اس قربانی کی تلافی کیسے کر سکوں گا؟"

"سلیم!" اُس نے میری نکٹائی کھولتے ہوئے کہا۔ "دُنیا میں مال و دولت اور فارغ البالی سے زیادہ اہم چیزیں بھی ہیں۔ کیا تم میرے مقابلہ میں دولت کو ترجیح دوگے؟ کبھی نہیں، اور نہ میں کبھی عیش و آسائش کو تمہارے مقابلہ میں زیادہ پسند کرونگی۔"

خالصتاً اپنی ایشیائی تربیت کے موافق وہ بغیر اپنے کسی جذبہ کو پوشیدہ رکھے اپنے دل کی ساری رام کہانی میٹھے میٹھے الفاظ میں بیان کئے جا رہی تھی :-

" تمہارے ساتھ رہنا تم کو اپنا سمجھنا بذاتِ خود ایک عشرت ہے۔ تمہاری دماغی سلطنت پر قابض و حکمران ہونا سب سے بڑی دولت ہے ، ہم کو ایک دوسرے کے ساتھ محبت ہی نہیں بلکہ عشق ہے اور ہم ایک دوسرے کے مفتوں ہیں۔ عین شباب میں ہم ایک دوسرے کے مالک ہیں اور ہمیشہ تک رہیں گے۔ میں اس دل سے بخوبی واقف ہوں "، اُس نے میرے سینہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ " اور جانتی ہوں کہ یہ ہمیشہ میرے لئے تڑپتا رہے گا۔ تم اس دماغ کو جانتے ہو "، اُس نے اپنے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ " اور یہ بھی جانتے ہو کہ اس میں صرف ایک خیال ہے اور وہ ہمیشہ تک قائم رہے گا۔ بس ہماری یہی مقبوضات دُنیا کے لئے قابلِ رشک ہیں اور ان فتوحات کے مقابلہ میں دولت کے انبار کے انبار کوئی حقیقت نہیں رکھتے کیوں سلیم ؟ "

اور میں نے اس کے جواب میں اُس کے شیریں ہونٹوں پر اپنے خشک ہونٹ رکھدئے۔

تقریباً ایک ہفتہ بعد مجھے والد کا ایک خط ملا۔ پروفیسر وب نے بٹلر کے ہاتھ یہ خط بھیجا تھا، کیونکہ ابھی تک میری ڈاک اُسی پتہ سے آتی تھی، چندرا ایک جگہ ڈنر پر گئی ہوئی تھی۔ یہ خط عجیب تھا۔ نہایت سنجیدہ اور نہایت تُرش۔ ہر لفظ اور ہر فقرہ حقارت اور نفرت سے پُر تھا۔ والد نے آئندہ کے لئے مجھے قریب قریب اپنا بیٹا سمجھنے سے اِنکار کر دیا اور میرا وظیفہ بھی بند کر دیا۔ میں نے اس خط کو اطمینان سے پڑھا اور میں ـــــ خوب ہنسا!!! اس وجہ سے کہ اُن کے تمام لفظ اور تمام فقرے میرے لئے محض بیکار تھے، اور فی الحقیقت ایک ایسی فطرت اور ایک ایسی ذہنیت پر اُن کا کیا اثر ہو سکتا ہے جو اپنی تمامتر قوتوں کے ساتھ محض ایک ہی تصوّر میں غرق ہو۔ وہ شخص جو خود اپنے عیش و آرام اور عزت و اقبال کو ٹھکرا چکا ہو، بھلا ان فروعی باتوں کا کب خیال کرتا ہے۔ میں اپنے والد کے بے معنی فقروں پر ہنستا رہا۔ اُن کے پُرزور الفاظ، عزت کی خواہش، دولت کی تمنّا اور اقبال کی آرزو کو بھڑکانے میں قطعاً ناکام رہے، کیونکہ مدت ہوئی یہ خوفناک چیزیں "الغرورِ اعظم" کے ساتھ دفن ہو چکی تھیں۔ میری "تربیت یافتہ" "خود پرستی" عرصہ ہوا ایک

دوسرے انسان کی محبت کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں غرق ہو چکی تھی۔

چندرا رات گئے واپس آئی۔ میں نے وہ خط اُس کے ہاتھ میں دیا، کچھ عرصے تک ایک غیر مکمل سا تبسم اس کے لبوں پر رقص کرتا رہا۔ وہ زندگی کی رنگا رنگی اور زمانے کے نشیب و فراز پر اپنی اعلیٰ دماغی کی بدولت ہنسا کرتی تھی، اور فی الحقیقت زندہ رہنا اُس کے نزدیک نہایت ہی سہل تھا۔ تنازع للبقا کو وہ ایک بے معنی سی چیز سمجھتی تھی۔ میں بھی محبت کے اثر سے اُس کی اس قابلِ رشک خصوصیت کا اثر قبول کرنے لگا تھا۔

خط ختم کرتے ہی اُس نے بھی ایک طویل قہقہہ لگایا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ایسا کرے گی۔

”کیوں نہ اسے نذرِ آتش کر دیا جائے سلیم!“

”یقیناً۔ چندرا!“ میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

اور چندرا نے اس خط کو جو ایک حد تک صرف ”خجلت کا وحشی“ ثابت ہوا آتشدان میں ڈال دیا اور دوسرے لمحے میرے والد کی ”گھنٹوں کی محبت“ راکھ ہو گئی۔

”سلیم! اب ہمیں جلدی روانہ ہو جانا چاہیئے“ چندرا نے

اپنے کپڑے اتارتے ہوئے کہا۔ کیوں نہ ہم پیرس ہوتے ہوئے جائیں۔"

"جیسی سلاتے ہو۔ میں کل کک کمپنی سے ٹکٹ لے لونگا۔" میں نے سڈول بازوؤں اور لانبی گردن پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"میں تو بالکل تیار ہوں، ذرا ان چیزوں کو باندھنا ہے۔" اور اُس نے اپنی میز پر نظر کی، جس پر بے شمار ہیئڈ، نقرئی قلمدان، کچھوے کی کھال کے برش، ہاتھی دانت کے چھوٹے چاقو، خوبصورت کتابیں، تیل، سینٹ کی شیشیاں، آئینے وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔ جو زیادہ تر میرے ہی پیش کردہ تھے۔

دو دن بعد ہم استنبول براہ پیرس روانہ ہوئے۔

آٹھواں باب

استنبول

شفاف نیلے آسمان کے نیچے میں اور چندرا دونوں ایک دخانی کشتی کے ڈک پر کھڑے صبح کی ٹھنڈی ہوا کا لطف اٹھا رہے تھے۔ اور قسطنطنیہ اپنا بجیا نک آغوش کھولے ہمارے سامنے تھا اور میں ایک غمناک حالت میں خاموش کھڑا اپنے مستقبل کے دھندلکے پر غور کر رہا تھا۔ دیکھئے قسطنطنیہ جس کی گلیوں میں میں بھیک مانگنے آرہا تھا، میرے لئے کیا تحائف پیش کرتا ہے۔ امیدوں کا ایک نرم و شبک سیلاب میرے دل میں موجزن تھا اور جیوں جیوں ہم بندرگاہ "گولڈن ہارن" کے قریب ہوتے جاتے تھے اس سمندر کے تموج میں تیزی آتی جاتی تھی۔

جیسے ہی کہ ہم نے ساحل پر قدم رکھا، میں اس خمار سے چونکا اور چندرا سے کہا "چندرا! تم ذرا اسباب وغیرہ اترواؤ میں اتنے عثمان کا پتہ لگاتا ہوں"

"یقیناً! مگر زیادہ دیر مت لگانا۔ عثمان رہتے کہاں ہیں؟"

"پیرا میں کسی جگہ رہتے ہیں، میں کسی نہ کسی طرح پتہ لگا لوں گا۔
ان گاڑی والوں سے پتہ معلوم ہو جائیگا۔"

چیتن را کو چھوڑ کر میں نے ایک گاڑی کرلیا اور پیرا کی طرف روانہ ہوا۔ پیرا عام طور سے قسطنطنیہ کا ممتول حصّہ کہلاتا ہے۔ اور گلاٹا سے لیکر پیرا کے آخر تک چڑھان سی ہے۔ گلیاں تنگ و تاریک تو نہیں لیکن بہت ہی کچھ اُجڑی اُجڑی سی معلوم ہوئیں۔ راستہ اتنا لمبا تھا کہ چلتے چلتے اندھیرا آگئی۔ بالآخر ایک مختصر سے مکان پر میرا گاڑی رکا اور اپنی اُجرت لیکر رُخصت ہوا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک تُرکی ملازم نے دروازہ کھولا اور غائب ہوگیا۔ فوراً ہی دوبارہ دروازہ کُھلا اور عثمان مجھ سے لپٹ گیا۔ ایک ترک کے لباس میں وہ بمشکل پہچانا جاتا تھا۔ مجھے گھسیٹ کر اندر ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ فوراً چائے آئی۔ مجھے بھی اُس سے مِل کر بہت خوشی ہوئی۔

"واللہ مجھے ہرگز اُمید نہ تھی کہ تم اتنی جلدی آجاؤگے۔ آج چند برس کے بعد ہم دونوں دوبارہ ملے ہیں۔ ولایت میں رہ کر تو تم نے خوب رنگ روغن نکالا۔ کبھی تمہارے فیل ہوجانے سے بہت

افسوس ہوا۔ بتاؤ تو آخر اس ناکامیابی کے باوجود تم اپنی صحت کیسے قائم رکھ سکے۔ تم تو بہت ہی ذکی الحس واقع ہوئے تھے۔ مگر یار تم فیل آخر کیسے ہو گئے"۔

"ارے کس کا فیل ہونا۔ احمق انسان! میں فرسٹ پاس ہوا"۔
عثمان چونک پڑا۔ اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
"لیکن آخر پھر کیوں ——— میں نہیں سمجھ سکا ——— پھر تم یہاں ——— ؟"

"میں نے یہی خیال کیا کہ ذرا ترکستان کی ہوا بھی کھا لوں اور کیا"۔ میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"لیکن کیا تم نے اس پر خوب اچھی طرح غور کر لیا ہے۔ اس کا نتیجہ بربادی ہے"۔

"جی!"، میں نے کہا۔ "کچھ آپ برباد ہوتے نظر آرہے ہوں گے جو میں تباہ ہو جاؤں گا"۔ میں نے طنزیہ طور پر مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگرچہ چہرے سے تو واقعی تباہی کے آثار نمایاں ہیں"۔

"نہیں بھئی، اصل میں رات بھر جاگتا رہا ہوں، کونسل کا ایک بڑا ضروری کام تھا۔ رات بھر فائل کے فائل ٹٹولتا رہا اور ہاں یہ

بھی جان لو کہ میں نے شادی بھی کر لی ہے۔"

"شاباش! اور میں نے بھی ایضاً!"

وہ دوبارہ تڑپ اُٹھا۔ "واللہ، سچ کہنا!"

"جی ہاں! اور ایک ریاست کی کماری سے! جی۔!!!"

"کمال کیا واللہ ـــــ تمہاری کوئی حرکت ہی آج تک سمجھ میں نہ آئی۔ آخر ایک ہندنی سے شادی کرنے کی تمہیں کیا ضرورت لاحق ہوئی تھی؟"

"ضرورت، خوب کہا آپ نے۔ جب تک تم چندرا کو ایک نظر دیکھ نہ لو، میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ تم ان الفاظ کو محفوظ رکھو۔"

"بہت بہتر! اچھا بھئی ملازمت کے بارے میں یہ ہے کہ سکرٹری شپ کا دار و مدار گورنمنٹ آف کونسل پر ہے۔ اس میں میرا کوئی دخل نہیں۔ تنخواہ بھی مقرر ہے وہی دو سو پچاس پونڈ سالانہ جو میں نے تم کو لکھا تھا۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"دیکھو بھئی عثمان! میں صرف تمہاری وجہ سے یہاں آیا ہوں اور اس وقت تمہاری مدد کی سخت ضرورت ہے، گویا ہم دونوں کی زندگی کا سارا دار و مدار تم پر ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم پرانی دوستی کا

حق ادا کر دو گے، اور ہر اُس مدد سے دریغ نہ کرو گے جو تمہارے امکان میں ہے۔" میں نے رازدارانہ لہجہ میں کہا۔ "دوسو پچاس پونڈ سالانہ بھی بھلا کوئی تنخواہ ہوئی۔ تم یہاں اتنے بڑے عہدہ پر ہو کیا اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ ہم کو ایک معقول جگہ دلوا دو۔"

" اچھا بھئی دیکھو! یہاں ایک ایجنسی کا کام اور ہے جو آج کل ایک ترک سوداگر کے ہاتھ میں ہے، میں وہ بھی تمہیں دلوا دونگا۔ دونوں ملا کر تین سو ساٹھ (۳۶۰) پونڈ سالانہ ہوتے ہیں۔ اور یہ بہت کافی ہوں گے۔ کام کو اس طرح تقسیم کر لو کہ تم اور تمہاری بیوی آسانی سے کر سکیں، اور کام دام کچھ نہیں ہے۔ فی الحال تو یہی کر سکتا ہوں، اور آئندہ انشاء اللہ زیادہ مواقع نکلتے رہیں گے۔"

"فی الحال! یقیناً یہ بہت غنیمت ہے۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں، اچھا دوست یہ تو بتاؤ ہمیں ٹھہرنا کہاں چاہیئے۔ کوئی عمدہ اور سستا سا مکان کرایہ پر دلواؤ، یا کوئی اور ترکیب بتاؤ۔"

" مکان یہاں کہیں بھی ڈھنگ کے نہیں ملتے یہ مکان میں نے خود بنوایا ہے۔ بہترین ترکیب یہ ہے کہ وہیں بندرگاہ پر جو کونٹی ننٹل کیفے ہے اُس میں ایک کمرہ لے لو کھانا وغیرہ کیفے میں کھاؤ اور رہو کمرے میں۔ نوکر بھی تم کو وہیں مل سکتا ہے اور باقی ہر طرح

کا آرام ہے، اور پھر کچھ ایسا مہنگا بھی نہیں۔ یوں ہونے کو تو بڑے ہوٹل بھی ہیں مگر خرچ زیادہ ہوتا ہے۔ میں جب یہاں آیا تھا تو میں بھی اسی کیفے میں رہا تھا میری رائے میں بہترین ترکیب یہی ہے۔"

"اچھا بھئی رخصت! چندرا غریب میرا انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہوگی ــــــ میں تم سے کل ملوں گا۔"

"اُونہہ! تم دونوں میاں بیوی آج رات کو میرے ہاں کھانا کھاؤ گے۔ سمجھے۔"

"اوہو! شکریہ شکریہ!" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور وہاں سے روانہ ہوا۔

چندرا بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ مگر مجھے کچھ ایسی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی، ورنہ شاید وہ ناراض ہوتی۔ بندرگاہ پر ہی ہم نے کھانا وغیرہ کھایا اور پھر باقی کا تمام وقت کمرے کی تلاش میں گذار دیا۔ لندن کے رفیع الشان ہوٹلوں کے مقابلہ میں ان ویران کیفوں کا کوئی کمرہ نظر میں نہ سماتا تھا۔ بڑی تلاش اور تجسس سے ایک ایسا کمرہ ملا جو بظاہر اُن سب کمروں سے اچھا تھا۔ فرش پر چٹائی بچھی تھی، ایک کونے میں ٹوٹی سی میز تھی، ایک

کرسی اور ایک پلنگ، تابدان پر ایک لیمپ رکھا تھا۔ بس کل یہی کائنات تھی۔

"بس جی تسلیم! یہ ٹھیک ہے!" چندرا نے کہا۔

ہم نے کیفے میں تیسرے پہر کو کافی پی اور وہیں سے بیٹھے ہوئے شام تک سڑک پر گذرنے والوں کی سیر دیکھتے رہے۔ شام ہوئی اور ہم عثمان کے ہاں روانہ ہوئے۔ ڈرائینگ روم میں ہم کو بٹھایا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد مسز اور مسٹر عثمان نمودار ہوئے۔ مسز عثمان ایک سیدھی سادی لڑکی تھی۔ صاف رنگ، اچھے خدوخال، بڑی بڑی آنکھیں، ناک ضرورت سے زیادہ لمبی، پتلے پتلے گلابی ہونٹ، بھرا بھرا جسم، میانہ قد، مگر پھر بھی اُس کے چہرہ میں کوئی خاص کشش یا جاذبیت نہ تھی اور چندرا کا اور اُس کا کوئی مقابلہ ہی نہ تھا، دوسرے یہ کہ وہ آجکل کچھ بیمار بھی تھی۔ کہاں چندرا کا کشادہ، درخشاں اور کھلا ہوا حسین چہرہ اور کہاں اُسکی غیر متناسب، اجڑی اجڑی اور کملائی صورت۔

عثمان چندرا کو دیکھکر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ دوران ڈنر میں بھی بیچارے چندرا کی صورت ہی دیکھتے رہے۔ اُس پر مستزاد چندرا کی موسیقی سے لبریز آواز اُس کا دلنشین طرز گفتگو اور پھر

اُس کے مخصوص قہقہے۔ غرض یہ کہ اُن پر اچھا خاصہ جادو ہو گیا۔

کھانے کے بعد عثمان سے رُخصت ہو کر ہم اپنے کمرے میں آئے جو کسی طرح دوزخ سے کم نہ تھا۔ کمرہ کھولتے ہی اُس میں سے گرم اور گھٹی ہوئی ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ چاروں طرف تاریکی تھی۔ چندرا نے مجھ سے دیا سلائی کا بکس مانگا۔ جیسے ہی کہ اُس نے لیمپ جلایا، چٹائی پر سرسر کی آواز آئی میں نے جُھک کر دیکھا۔ ایک موٹی سی ترکستانی مکڑی تیزی سے دیوار پر چڑھ گئی۔

"یہ یونانی زینوفون کی مکڑیوں سے کس قدر مُشابہ ہیں"، میں نے کہا "اُن کا زخم حُسن کے زخم سے بھی زیادہ گہرا ہوتا ہے۔"

ایک قہقہہ لگا کر چندرا اپنا لباس تبدیل کرنے میں مشغول ہو گئی۔ میں نے کمرے کی کھڑکی کھولی اور خود بھی کپڑے وغیرہ اُتار کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کتنی ذلیل جگہ میں چندرا کو لایا ہوں" رہ رہ کر مجھے یہی خیال ستاتا تھا اور میری ہمت نہ ہوتی تھی کہ میں چندرا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکوں۔ چندرا آئی اور میرے گھٹنے پر بیٹھ گئی ــــ زیادہ تر اس وجہ سے کہ کمرے میں صرف ایک ہی کرسی تھی۔

"چندرا!" میں نے اس کے سیاہ بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔
"تمھیں میری محبت میں یہ غریبی اور مفلسی کی زندگی بسر کرنی پڑی!"
"سلیم! مجھے تم سے محبت ہے اور اس کے بدلے میں مجھے"
اس نے میرے رخساروں پر بوسہ دیتے ہوئے کہا "یہ مسرت حاصل ہے۔!!!"

نواں باب

ارتقائے عشق

قسطنطنیہ آئے ہوئے ہمیں ایک ہفتہ گذر گیا، اور پھر دوسرا ہفتہ بھی، اور ہم اُسی طرح خوش تھے جیسے پہلے۔ یہ ضرور ہے کہ تمام بنی نوع انسان کی زندگی کی طرح ہماری روزمرہ کی زندگی بھی ہزاروں معمولی اور فروعی تکلیفوں سے پُر تھی۔ کام جو مجھے کرنا پڑتا تھا کچھ ایسا مشکل نہ تھا لیکن ذمہ داری اور گھس گھس بہت تھی۔ صبح نو بجے سے شام کے سات بجے تک دھوپ میں ایک تپتے ہوئے سائبان کے نیچے بیٹھا رہنا پڑتا تھا۔ تنخواہ معمولی تھی اور چٹ پٹ میں اُڑ جاتی تھی۔ اس کے علاوہ جب دو ایسی ہستیاں جن کی آمدنی محدود ہو ایک ہی جگہ اور ایک ہی ساتھ رہیں، تو اُن میں سے ایک کو لازم ہے کہ وہ اپنے آرام اور چین کو دوسرے کی خوشی کی خاطر قربان کر دے، اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ شخص میں ہوں گا۔ چنانچہ میں ہمیشہ تیار رہتا تھا کہ اُن تمام

چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو اپنے سر لے لوں، جن سے ہمارا روز کا سابقہ تھا۔

چندرا کی عادت تھی کہ وہ رات بھر لیمپ جلا رہنے دیتی تھی، اور اس سے مجھے خاصی تکلیف پہونچتی تھی۔ مٹی کے تیل کی بُو سے رات بھر میرا دماغ پریشان رہتا تھا۔ اِس کے علاوہ پروانے اور ہزاروں قسم کے ترکستانی کیڑوں کی اس قدر بارش ہوتی تھی کہ پلک جھپکانی میرے لئے مشکل تھی۔ بیسیوں راتیں میں نے بیٹھے بیٹھے گذار دیں، اور یہ میں چاہتا نہیں تھا کہ چندرا کو کسی طرح بھی اس بات کا علم ہو۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ فوراً لیمپ کو بُجھا کر پھینک دے گی اور پھر اپنی عادت کے خلاف میری خاطر اندھیرے میں سونا پسند کرے گی۔ غرض ایسی ہی معمولی تکالیف کو برداشت کرنے میں نے اپنی خانگی زندگی کو بہت ہی خوشگوار بنالیا تھا۔ اور رفتہ رفتہ میں بھی کچھ عادی سا ہوگیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری اُلفت اُس درجہ پر پہنچ گئی جہاں مجنوں لیلیٰ بن کر رہ جاتا ہے اور لیلیٰ مجنوں۔

چندرا جیسا ہم خیال ساتھی کوئی دوسرا ہو نہیں سکتا۔ ہم دونوں اس درجے ہم خیال واقع ہوئے تھے کہ یہ قطعی ناممکن تھا کہ

ہم ملتے اور ایک دوسرے سے محبت نہ کرتے۔ بظاہر وہ ڈاکٹر تھی اور سوائے ادویات یا جرّاحی کے کسی چیز سے اُسے مَس نہ ہونا چاہیئے تھا۔ مگر لٹریچر اور فلسفہ میں بھی وہ کافی دسترس رکھتی تھی۔ اکثر راتوں کو جب کہ ہم دونوں کو نیند نہ آتی تھی تو وہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر ایک ڈکٹیٹر کے انداز میں پلیٹو کے "نظریہ حیات" پر مجھ سے بحث کیا کرتی اور کبھی یونانی حکماء کے سوفسطائی اقوال کا ویدانت سے مقابلہ کرتی اور میں حیرت و استعجاب سے اُس کا مُنہ تکا کرتا۔

سردی روز بروز کم ہونی شروع ہوئی اور بالآخر شدید گرمی نے اپنا تسلّط جما لیا۔ دن تو خیر مصروفیات میں کسی نہ کسی طرح گذر ہی جاتا تھا، مگر راتیں کاٹے نہ کٹتی تھیں اور اس پر مچھروں کا زور شور، غرض قیامتِ صغریٰ کا نمونہ تھا۔ ایک رات درجۂ حرارت ۱۱۰ سے بھی زائد ہو گیا۔ چندرا تھکی ہاری پلنگ پر پڑی پسینہ میں نہا رہی تھی، اور میں فرش پر اپنے بستر میں لوٹ رہا تھا اور مکڑیاں اور ہزاروں قسم کے کیڑے مکوڑے مجھ پر سے گذر رہے تھے۔ میں اُٹھا اور چندرا کی عرق آلود پیشانی کو چوما۔ وہ غالباً اس سے بھی زیادہ گرمی میں سونے کی عادی تھی، اس لئے

بے خبر پڑی سو رہی تھی۔ وہ ایسی صبر کی بندی تھی کہ سخت قسم کی تکالیف میں بھی اُس کے مُنہ سے کبھی آہ نہیں نکلی۔ نہ کبھی وہ کسی قسم کی شکایت کرتی تھی۔ اگر کوئی چیز اُس کی مرضی کے خلاف بھی ہوتی تھی تو وہ اُسے بکمال مسرت برداشت کر لیتی تھی۔

"کیوں نہ ایک چھوٹا سا پنکھا یہاں لگایا جائے!" میں نے سوچا اور قطعی ارادہ کر لیا۔ دوسرے دن چندرا کی غیر حاضری میں میں نے بانس کے ٹکڑوں سے ایک چھوٹا سا پنکھا بنا لیا اور اس پر چھوٹی چھوٹی کیلوں سے اپنی چادر منڈھ دی۔ کیفے کے ملازم سے میں نے تین قلابے منگوائے اور جیوں تیوں اُس پنکھے کو لٹکا دیا۔ پھر میں چندرا کی جگہ لیٹ گیا اور ملازم کو اپنی جگہ بٹھا کر اُس سے پنکھا جھلوا کر دیکھا۔ خوب ہوا آتی تھی، اپنی اس شاندار کامیابی پر میں بہت خوش ہوا۔ چندرا بھی اس "عیاشی" سے بہت خوش ہوئی۔ لیکن روز ہماری لڑائی ہوتی تھی۔ وہ کہتی تھی میں پنکھا کھینچوں گی اور میں کہتا تھا میں۔ لیکن میں نے اُسے یقین دلایا کہ وہ پلنگ پر لیٹنے کے بعد بیس منٹ کے اندر اندر سو جاتی ہے اور سونے کے بعد اُسے دُنیا و مافیہا کی بھی خبر نہیں رہتی اس لئے مجھے زیادہ سے زیادہ بیس منٹ تک پنکھا کھینچنا پڑتا

ہے اور جس کے لئے مجھے کوئی خاص مشقت نہیں کرنی پڑتی لیکن اس پر بھی وہ روز مجھ سے "روٹھ" جایا کرتی اور میں پھر اُسے کسی نہ کسی طرح منا لیا کرتا تھا۔

میں ترستا ہوں اُس وقت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے جبکہ میں طویل سُنسان اور گھمسان راتوں میں چٹائی پر لیٹا گھنٹوں نہیں بلکہ تمام تمام رات اپنی چندرا کو پنکھا کھینچ کھینچ کر سُلایا کرتا تھا اور خود مکڑیوں اور مچھروں سے لڑلڑ کر صبح کر دیتا تھا!!! اپنے درخشاں ماضی کی شدید سے شدید تکلیف پر میں موجودہ بڑے سے بڑے عیش کو قربان کر دینے کے لئے تیار ہوں۔

موسم روز بروز خشک اور گرم ہوتا گیا۔ ایک تپتی ہوئی دوپہر کو مجھے عثمان نے بذریعۂ خط کو "تارسمجھو" فوراً بلوایا۔ میں گیا اور اس کے چہرہ کو معمول سے زیادہ اُداس پایا۔

"آؤ بھئی سلیم! میں تمہارا انتظار ہی کر رہا تھا۔ بات یہ ہے کہ اوڑیا نوپل میں ہارلی نامی ایک انگریز ہمارا ایجنٹ تھا۔ اب وہ بیمار ہو کر رخصت پر جا رہا ہے۔ مجھے اُس کی جگہ ایک لائق آدمی کو رکھنا ہے اور اس کے لئے میں نے تم کو منتخب کیا ہے۔ اب تم بتاؤ؛

کیا تم جا سکو گے؟"

"مجھے کوئی اِنکار نہ ہوگا" میں نے کہا "لیکن یہاں کا کام کون سنبھالے گا؟"

"یہاں کی تم فکر نہ کرو۔ میں مقامی ناظم سے اس کا بندوبست کرا دونگا، اب تم بتاؤ کیا کل تم جا سکو گے؟"

"اتنی جلدی!" میں نے کہا "چندرا بھی تو آخر میرے ساتھ ہے"

"لیکن بھئی! ایسا بھی کیا! تم چندرا کے ساتھ بالکل نتھی ہو گئے ہو" عثمان نے حیرت سے پوچھا۔

آپ کی دعا سے!" میں نے جواب دیا "سنو بھائی صاحب! صاف بات ہے۔ تم مجھے چندرا کی ہمراہی میں چاہے دنیا کے دوسرے سرے پر بھیج دو۔ لیکن ویسے میں اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا"

"لیکن اس کو وہاں لے جانے کی آخر کون سی ایسی ضرورت ہے۔ ہارلی نہایت خوش اسلوبی سے کام کرتا رہا ہے اور تمہیں وہاں کوئی زحمت نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ اگر چندرا یہاں ہی تو اس کی موجودگی سے مجھے بہت مدد ملے گی"

"مجھے افسوس ہے" میں نے کہا "میں چندرا کو ایک منٹ کے لئے بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ تم چاہے تنخواہ میں کمی کر دو"

"یہ تو محض حماقت ہے۔ کیا تم ایک ہفتہ کے لئے بھی چندرا کو نہیں چھوڑ سکتے، جب کہ ایسا ضروری کام ہو، اور تمہارا بھی اس میں فائدہ ہو"

"مجھے اگر وہاں بھیجنا منظور ہے" میں نے کہا۔ "تو چندرا میرے ساتھ ضرور جائے گی۔ تم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہو کہ جو تنخواہ تم لکیلے ہارلی کو دیتے تھے اُس کی نصف تم ہم دونوں کو دیدو۔ بس"

عثمان کو خوب غصّہ آ رہا تھا لیکن میں مجبور تھا۔ آخر بولا۔

"اچھا! خیر میں کوئی نہ کوئی انتظام کروں گا، تم وہی تنخواہ لوگے جو یہاں لیتے رہے ہو، اس کے علاوہ اسپیشل کمیشن بھی پچاس فیصدی کے حساب سے ملتی رہے گی"

عثمان سے وہاں کے کام کے متعلق ہدایات حاصل کرنے کے بعد میں واپس ہوا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید چندرا اس تبدیلی کو پسند نہ کرے۔ اگر اُس کی مرضی نہ ہوئی تو ہم نہ جائیں گے اور کیا لیکن جب اس کے متعلق اُس سے گفتگو ہوئی تو وہ بہت خوش ہوئی، اُس کی فطرت اُن بے چین، غیر مطمئن، اور بے پروا شخصیتوں کی سی تھی جو ہمیشہ کسی نہ کسی تبدیلی کی شائق رہتی ہیں ہم نے اپنا تمام غیر ضروری سامان کیفے کے مینجر کے سپرد کر دیا اور اوڑیانوپل

روانہ ہوئے۔

اس میں کچھ کلام نہیں کہ یہاں ہم بدرجہا بہتر ہیں۔ ہارلی یہاں پانچ برس تک رہ چکا ہے۔ اور کوٹھی، باغ وغیرہ سب اس کے ذاتی تھے اور خوب آرام دہ۔ سامنے سرد کی قطار کے پیچھے سڑک چلتی تھی۔ کوٹھی خوب ہوادار اور ہر قسم کے سامان سے آراستہ تھی۔ ہارلی ایک ملازم بھی چھوڑ گیا تھا، اور ہمیں کسی قسم کی تکلیف نہ تھی۔ کام جیسا کہ عثمان نے کہا تھا، ایسا تھا کہ ایک آدمی اسے آسانی کر سکتا تھا اور دو آدمیوں میں تو معلوم بھی نہیں ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ دن رات مزے کیا کرتے تھے۔ خوب سوتے تھے، خوب ہنستے تھے، خوب مباحثے کیا کرتے تھے۔ گویا وہاں کی زندگی ایک مستقل تعیش، تھی۔

چندرا ہماری روزمرہ کی زندگی کی حکمران تھی۔ اٹھنے کا وقت ناشتہ کا وقت، ٹہلنے کا وقت، کام کا وقت، کھانے کا وقت پھر دوپہر کا قیلولہ۔ اور پھر چائے، شام کی سیر، رات کا کھانا۔ غرض یہ کہ ایک ایک فعل اور ایک ایک حرکت کی وہ مالک تھی اور جیسے جی چاہے احکام نافذ کیا کرتی، اور میں دنیا و ما فیہا سے بے خبر ہر وقت چندرا کے احساس ملکیت کے نشے میں مگن رہتا تھا۔

اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے "حال" کو اہم تصور کیا، ورنہ میں ہمیشہ سے صرف "مستقبل" کے لئے زندہ رہتا تھا۔

اڈربا نوپل میں قیام کا مختصر زمانہ گویا میری زندگی کا عطر تھا۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اطمینانِ قلبی کے طلائی رشتہ میں بے پایاں مسرت اور تعیش کی چند ساعتوں کے گوہر پرو دئے گئے تھے۔ اب بھی جب میں اُس یادگار زمانے کا تصور کرتا ہوں تو مجھ پر صاف طور سے یہ روشن ہو جاتا ہے کہ میں اپنی تمام عمر میں کبھی اتنا باوقار نہیں نظر آیا۔ جتنا کہ اُن ایّام میں، جب کہ میری زندگی ایک جذبۂ عظیم کے تحت اپنے ارتقائی منازل طے کر رہی تھی۔

اس "جذبۂ عظیم" (عشق) نے مجھے وہ وہ باتیں سکھائیں جن کی تلقین دُنیا کا ہر مذہب کیا کرتا ہے۔ خود فراموشی اور "ایثار" اپنی ہر اُس خواہش اور ہر اُس فعل کو روکنا جس سے کسی دوسرے انسان کو اذیت پہونچنے کا امکان بھی ہو، میں نے اِسی "جذبۂ عظیم" سے سیکھا۔ اس "اشتراکِ مکمل" کی زندگی نے ہم دونوں کی انفرادیت کو قطعی فنا کر دیا تھا۔ اکثر ہم دونوں کے درمیان مکالمہ بالکل نہ ہوتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم دونوں کے

دماغ ایک دوسرے سے نقل افکار کر لیتے ہیں اور مکالمہ کی حاجت نہیں ہوتی۔ اُس کی موجودگی میرے ذہن کے لئے ایک دوامی غذا تھی اور ہر لحظہ مجھے خوش رہنے اور خوش رکھنے پر آمادہ کرتی رہتی تھی۔

ایک سنہری صبح کو میں ڈرائینگ روم میں بیٹھا ایک سرکاری دستاویز کا ترکی میں ترجمہ کر رہا تھا اور چندرا باہر باغیچہ میں مصروفِ گلگشت تھی۔ میں دستاویز کو ختم کرنے ہی والا تھا کہ چندرا کی سبک چاپ نے مجھے چونکا دیا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی اور ایک لفافہ مجھ کو دکھا کر یوں گویا ہوئی:۔

"یہ خط ابھی ابھی آیا ہے" میں نے بغیر نظریں اُٹھائے کہا "دیکھو کس کا ہے اور کیا لکھا ہے"۔

اور میں بدستور لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ جب خاموشی زیادہ طویل ہوئی تو میں نے اُوپر دیکھا۔ چندرا کا چہرہ غیر معمولی طور سے سنجیدہ تھا "خیریت؟ کیا بات ہوئی؟"

"عثمان صاحب ہم میں سے ایک کو قسطنطنیہ طلب کرتے ہیں کیونکہ ہمارا قائم مقام غبن کر کے فرار ہو گیا ہے"۔

"لاحول ولا قوۃ! عثمان بھی عجیب آدمی ہے۔ یہ بات اُس کے

ذہن میں سما گئی ہے کہ یہاں صرف ایک آدمی کا کام ہے۔" میں نے کہا۔ چندرا خاموش رہی۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر میری میز پر سے دیا سلائی کا بکس اُٹھایا اور خاموشی سے اُس خط کو جلا دیا۔ روشنی کی چمک سے میں چونکا اور گھبرا کر بولا "یہ کیا کیا ۔۔۔!! میں نے تو ابھی اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔"

چندرا اپنی مخصوص مسکراہٹ سے بولی۔ "اوہو! کیا آپ اس کو دیکھنا چاہتے تھے۔ تب تو واقعی مجھ سے غلطی ہوئی۔ مجھے بڑا افسوس ہے۔"

مجھے ذرا سا غصہ آیا۔ اس طرح ایک خط کو جلا دینا یقیناً حماقت تھی۔ خیر صبر! میں نے قلم کو مضبوط پکڑتے ہوئے کہا "کوئی مضائقہ نہیں لیکن تم جو کچھ کیا کرو ذرا غور کے بعد کیا کرو۔"

چندرا خاموش تھی۔

جب میں دستاویز مکمل کر چکا تو میں نے دیکھا چندرا میری میز پر کہنیاں ٹکائے مجھے گھور رہی تھی۔

"ہم میں سے ایک کا قسطنطنیہ جانا لازمی ہے۔" اُس نے سنجیدگی سے کہا "عثمان کے پاس سر دست کوئی معقول آدمی نہیں ہے اور کام سارا تتر بتر ہوا پڑا ہے ۔۔۔ اگر ہم میں سے کوئی نہ گیا

تو وہ برابر تقاضہ پر تقاضہ کرتا رہے گا۔ اور ہماری زندگی دشوار ہو جائے گی۔ اور شاید وہ ہم دونوں کو برطرف کر دے۔"

"ہاں" میں نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے جانے دو" اُس نے قطعی فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور میں اکیلا دم توڑتا رہوں؟"

"مصلحت اسی میں ہے" اُس نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

میرا سر چکرانے لگا اور میری نبض کی رفتار سست ہو گئی۔

"کیا تم قسطنطنیہ جانے کے لئے اس قدر بے چین ہو۔ کیا تم کو ہمارا جُدا ہو جانا ناپسند ہے؟" میں نے ایک بناوٹی تبسم کے ساتھ دریافت کیا۔

روشنی کی ایک گرم لہر اُس کی شوخ آنکھوں میں دوڑ گئی۔

"ہرگز نہیں ——— یہ آپ نے کیسے اندازہ لگایا؟ آخر کیا کیا جائے۔ ہم میں سے ایک کا جانا ناگزیر ہے۔"

تو آخر وہ "ایک" میں کیوں نہ ہوں؟" میں نے پوچھا۔

خفیف سی ہراسانی اور خوف کے آثار اُس کے چہرے سے ظاہر ہوئے۔

"نہیں سلیم! میں تمہارے بغیر یہاں نہیں رہ سکتی۔ آگ بدرجہا

بہتر قسطنطنیہ کی تنہائی کی زندگی ہوگی۔ للّٰلہ مجھے مجبور نہ کرو اور وہاں جانے دو۔"

"جانِ من! کیا میں نے تم کو کبھی کسی ایسی چیز پر مجبور کیا ہے جسے تم پسند نہ کرتی ہو؟ اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو خیر!" میں نے روکھے لہجہ میں کہا اور معاملہ قریب قریب طے ہو گیا۔

دن بھر میں عثمان کو کوستا رہا اور آنے والے جدائی اور تنہائی کے کٹھن دنوں کو گذارنے کا پروگرام بناتا رہا۔ رات آئی اور چندرا میرے بازو پر سر رکھ کر غافل ہو گئی اور میں مسرت کے ان قیمتی لمحات سے کماحقہ حظ حاصل کرتا رہا۔ دوسرے دن چندرا مجھ سے رخصت ہوئی اور میں اکیلا رہ گیا ــــ خوش وضع اور آرام دہ کوٹھی مجھے کاٹنے کو دوڑنے لگی۔ باغیچہ جو چندرا کے سامنے جنتِ ارضی کا نمونہ تھا، اب ایک اجڑا ہوا اور سنسان صحرا معلوم ہونے لگا۔ دن تو خیر برے بھلے گذر ہی جاتا تھا مگر راتیں، اُف! تنہائی کی تلخیوں سے لبریز، کاٹے نہ کٹتی تھیں۔ باغیچہ میں ٹہل ٹہل کر میں صبح کر دیتا تھا۔ روش کے کنارے ستواں سرو کی قطار تھی جو مجھے ہر وقت چندرا کے قامت کی یاد دلاتے رہتے تھے۔ کہیں کہیں سے شہر کی سفید سفید عمارتیں نظر آتی تھیں۔ ان ہی چیزوں کو

تکتے تکتے صبح ہو جاتی تھی اور میں پھر اپنے کام میں مشغول ہو جاتا تھا۔ ایک خیال ہر وقت میرے دماغ میں رہنے لگا "کیا چندرا کو قسطنطنیہ جانے سے خوشی حاصل ہوئی؟ کیا اُس نے مجھ سے جُدا ہونا پسند کیا؟ کیا اُلفت و عشق کے جذبات سرد ہو گئے؟" یہ خیال بڑھتا گیا اور رفتہ رفتہ میرے دل میں جاگزیں ہو گیا، مجھے یقین ہو گیا کہ واقعی اب وہ مجھ کو پسند نہیں کرتی۔ ایک وحشیانہ اور غضب ناک اُداسی مجھ پر ہر وقت مسلط رہنے لگی۔

چندرا کو گئے ہوئے پورے پندرہ دن ہو گئے۔ اگر عثمان چاہتا تو اتنے عرصہ میں کوئی اور انتظام کر سکتا تھا، مگر اُس کی دلی تمنا تو ہم دونوں کو جُدا کرنا تھا۔

ایک رات میں حسبِ معمول جاگ رہا تھا، کچھ نزلہ وغیرہ کی شکایت ہو گئی تھی، اس لئے بجائے باغیچہ میں ٹہلنے کے میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ برابر والی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور ایک تیز لیمپ روشن تھا آج دن بھر میں "گلنے سے Oro" پڑھتا رہا۔ اس سے بہتر زمانہ ایسی کتاب پڑھنے کا نہ کبھی آیا اور نہ شاید آئے۔ دُکھتے ہوئے دل نے خوب خوب لُطف اُٹھایا۔

ایک دُور کی آواز میرے کان میں آئی ———" سلیم بے ———

میں چونک پڑا۔

رات بالکل سنسان تھی اور ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اچانک برآمدہ کے قریب "کھٹکا" ہوا۔ پھر کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ میں نے دوڑ کر دروازہ کھولا۔ چندرا میرے آغوش میں تھی! سر سے پاؤں تک خاک میں اَٹی ہوئی اور پسینہ میں شرابور، وہ اب بھی اتنی ہی حسین تھی جتنی کہ ونٹنر میں۔ پیٹنٹ لیدر کا نازک سا جوتا چیتھڑے چیتھڑے ہو گیا تھا، اور ایک تو خون سے بھرا ہوا تھا۔ وہ معمول سے زیادہ تھکی ہوئی تھی، میں نے دوڑ کر برانڈی کا ایک گلاس اُس کے مُنہ سے لگا دیا۔ اور کھانا لانے کے لئے دوڑنا چاہتا تھا کہ چندرا بولی :۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیئے سلیم! سوائے تمہارے محبّت بھرے آغوش اور ایک بوسہ کے! اسی غرض سے میں بائیس میل پیدل آئی ہوں" اور اتنا کہہ کر وہ میرے کُھلے ہوئے آغوش میں گر پڑی اور بکس بکس کر رونے لگی۔ اُس کا تمام جسم کانپ رہا تھا۔ میرے جسم میں بھی بجلی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اور ہم دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے سے لپٹ کر روتے رہے۔

اس زندگی میں کچھ لمحے ایسے بھی آتے ہیں جب ہم اپنے حساسات

اور کیفیات سے اس درجہ مغلوب ہو جاتے ہیں کہ اپنی بُرد باری اور سنجیدگی کو قطعی فراموش کر دیتے ہیں اور ایک اضطراری کیفیت سی ہم پر طاری ہو جاتی ہے۔

ہم دونوں کی رُوحیں ایک دوسرے سے اتنی قریب قریب تھیں کہ اُن کے غیر فانی اور ابدی ہونے میں کچھ کلام نہیں ہو سکتا تھا۔

"تم سے جُدا رہنا موت کے برابر ہے سلیم! میں مجبور ہو گئی تھی کہ تم سے کسی نہ کسی طرح ملوں۔" اُس نے کہا اور اپنا خاک آلود چہرہ اوپر کیا، جس کی تازگی اور بشاشت اُسی طرح قائم تھی۔ میں جُھکا اور اُس کے لبوں سے اپنے لب ملا دئیے۔ اس کا تصور تھی کہ اُس نے اس گرمی اور دھوپ میں بائیس میل کا سفر صرف اس لئے کیا کہ وہ مجھ سے مل سکے۔ میرے دماغ کو ماؤف کر دیتا ہے۔

وہ لمحہ بہ لمحہ مضمحل ہوتی جا رہی تھی میں نے زبردستی اُس کو برانڈی کا ایک گلاس اور پلا دیا۔

"تم نے بڑی ہمت کی، آخر یہ سوجھی کیا تھی تمہیں۔ مجھے لکھ دیتیں، میں ایک دو روز کی رُخصت لے لیتا اور تم سے آکر

مل جاتا ہے۔"

"لائن ٹوٹی ہوئی تھی اور ڈاک بالکل بند تھی۔ سوائے اس کے اور کوئی تدبیر نہ تھی کہ میں پیدل چل کر تم سے ملوں، اور یہ کچھ ایسی بہادری کا کام نہیں ہے، پلیٹو کے قول کے مطابق محبت کرنے والے دیدار، آغوش اور ایک بوسہ کی خاطر اپنی جان پر کھیل جاتے ہیں۔"

اُس کا سر میرے کندھے پر رکھا تھا اور میں نے سیاہ ریشمیں گیسوؤں پر سے خاک جھاڑی۔

"راستہ بھی تو دشوار ہے۔ تم دفتر سے کے بجے روانہ ہوئی تھیں" میں نے پوچھا۔

"اب دفتر وغیرہ کچھ بھی نہیں ہے" چندرا نے جواب دیا۔ "بلا کی گرمی پڑ رہی ہے اور بہت سے آدمی شہر سے باہر چلے گئے۔"

میری حیرت میں اس جواب سے اور اضافہ ہوا۔ "تم کے بجے وہاں سے چلی تھیں؟"

"میں پورے پانچ گھنٹے تک برابر چلتی رہی۔ بس اس سے اندازہ لگا لو" اُس نے اپنا گاؤن اُتارتے ہوئے کہا جس کے نیچے وہ صرف ایک باریک ململ کا باڈس پہنے ہوئے تھی جس میں

سے اُس کا گداز جسم اور بھرے بھرے بازو صاف جھلک رہے تھے۔
"میں شاید اس سے پہلے یہاں پہونچ جاتی مگر اس منحوس زخم کی وجہ سے آدھے سے زیادہ سفر میں نے لنگڑاتے ہوئے کیا۔ میرا پاؤں ایک شیشے پر پڑ گیا تھا اور مجھے اس کی وجہ سے خاصی تکلیف ہوئی"
یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے جوتے (جو ایڑیوں سے کم نہ تھے) اُتار کر پھینک دئے۔

میں اُس کے زخم کو ڈریس کرنا چاہتا تھا مگر اُس نے کہا "اس کا کچھ ایسا خیال مت کرو، زخم معمولی ہے اور اب اُس پر خاک کی تہ چڑھی ہوئی ہے۔ فی الحال ہمیں اِس مختصر صحبت کو یوں رائیگاں نہ کرنا چاہیئے۔ مجھے کل صبح پھر واپس جانا ہے۔ سلیم! قسطنطنیہ میں رہ کر میرا دماغ ماند پڑ گیا تھا۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ تیرا فی محبت کے تیز شعلوں سے اُسے دوبارہ روشن کر لوں۔ میں تمہارا چہرہ دیکھنے کو تڑپ رہی تھی" اور اتنا کہہ کر وہ اُسی نیم برہنگی کی حالت میں مجھ سے لپٹ گئی۔

آج اُس کی اس مجنونانہ حرکت سے مجھے قطعی یقین ہوگیا کہ اُس کو مجھ سے اُلفت ہی نہیں بلکہ ایسا عشق ہے جس کی مثال بیسویں صدی میں ملنی محال ہے۔ مجھ پر ایک اضطراری کیفیت طاری

ہونی شروع ہوئی اور میرا دماغ ایک عجیب کیف و سکر کے عالم میں اُس بلندی پر پرواز کرنے لگا جو بذاتِ خود "حاصل عمر" کہلایا جا سکتا ہے۔ اس کا تصور ہی کہ چندرا کی آزاد اور مسرت بخش رُوح اور اُس کے ملکوتی پیکر کا صرف میں ہی مالک ہوں، میرے دماغ کو ماؤف کرنے کے لئے کافی تھا۔ وہ میری تھی اس زندگی ہی میں نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے۔ مجھے یقین تھا کہ ہم دونوں کی روحیں جسم کی قید سے رہا ہونے کے بعد بھی ہمیشہ تک ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا رہیں گی۔

ہوش آنے پر پہلا اور آخری جملہ جو میں سُن سکا وہ یہ تھا۔ "تسلیم! اب میں خوش ہوں، آؤ ہم دونوں ابد تک ایک دوسرے کے آغوش میں سوتے رہیں"۔

دوسری صبح چندرا کا اضمحلال دُور ہو چکا تھا۔ اُس کی دیرینہ شگفتگی، شوخی اور بشاشت دوبارہ عود کر آئی تھی۔ اس کی نظریں لب و لہجہ اور انداز اُس کے مخصوص وقار کے حامل تھے۔ وہ معمول سے زیادہ میری گرویدہ نظر آرہی تھی، اور اُس کے ہر اُس شغل میں جس کا میری ذات سے تعلق ہو، غیر معمولی لگاوٹ اور شیفتگی کی جھلک تھی۔ لیکن اِس کے باوجود وہ واپس جانے پر

تُلی ہوئی تھی۔

"مجھے قطعی جانا چاہیے اور میں ضرور جاؤں گی" اُس نے میرا شانہ دباتے ہوئے کہا "میں تم سے مل لی اور اب مجھے اطمینان ہوگیا۔"

وہ اپنے پاؤں کے زخم کو اپنے حاصل کردہ علم کی بدولت خوب اچھی طرح ڈریس کر چکی تھی۔

بالآخر وہ منحوس لمحہ آ ہی گیا جس کا مجھ کو سرِ شام ہی سے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ چندرا نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور اپنا گداز ہاتھ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "خدا حافظ سلیم۔" میں چونک پڑا اور شاید کچھ دیر تک مبہوت سا بنا رہا جب ہوش اس سجا ہوئے تو میں نے ایک ایسے لہجہ میں جو خود میرے کانوں کو عجیب معلوم ہوا کہا "چندرا! تمہارے بغیر میں یہاں کیسے زندہ رہ سکوں گا۔ عالمِ اسباب نے ہمیں مجبور کر رکھا ہے میرا بس نہیں چلتا کہ تم کو ساتھ لیکر کہیں چلا جاؤں —— کاش میں فی الحال تمہارے ساتھ قسطنطنیہ ہی جا سکتا۔"

چندرا نے اپنی گرم، شفاف، صندلی باہیں میری گردن میں حمائل کرتے ہوئے تسلی بخش لہجہ میں کہا۔ "نہیں سلیم! دس پندرہ

رہو اور یہاں ٹھیرو، جب تک ہارلی آ جائے گا، اور اس کے بعد ہم کچھ عرصہ تک تعطیل منائیں گے ــــــ مصلحتِ وقت یہی ہے کہ تم یہاں رہو۔"

دسواں باب

قسطنطنیہ ــــ شہرِ خموشاں

اس واقعہ کے بعد میں روزہارسلی کی واپسی کا منتظر رہتا تھا کہ ایک دن اچانک میرے پاس ایک تار آیا کہ سر ہنری جو برطانیہ گورنمنٹ کے "ایسے سڑ" رہتے تھے، اڈریا نوپل آنے والے ہیں اور یہ کہ میرے ہاں ٹھیریں گے۔ سر ہنری ہندوستان میں کلکٹر رہ چکے تھے اور اتفاق سے میرے والد کے دوست بھی تھے۔ میں نے کبھی اُن کو بچپن میں دیکھا تھا۔ شام کو چھ بجے کے قریب وہ آگئے اور مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ میں بھی حتی الوسع خندہ پیشانی سے پیش آیا۔

ڈنر پر سر ہنری نے سوائے اِدھر اُدھر کی گفتگو کے کوئی کام کی بات نہیں کی، وہ جانتا تھا کہ میں اپنے والد سے لڑکر یہاں پڑا ہوا ہوں، اور اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ بنائے مخاصمت کیا ہے مگر اُس نے اشارتاً بھی کوئی اس قسم کا ذکر نہیں کیا۔ ڈنر کے اختتام پر

اُس نے ایک سگار سُلگاتے ہوئے کہا۔

"سلیم! مجھے تمہارے کسی فعل سے کوئی تعرض نہیں، مگر ایک بات تمہاری مجھے ذرا ہلکی سی معلوم ہوئی۔ تمہیں معلوم تھا کہ قسطنطنیہ میں زبردست قسم کا طاعون پھیلا ہوا ہے اور تم نے اپنی جان بچاتے ہوئے ایک غریب عورت کو اپنا قائم مقام بنا کر بھیج دیا۔"

اگر سرنہری مجھ پر ایک بم پھینک دیتا تو مجھے اتنی زیادہ حیرت نہ ہوتی جتنی کہ اُس کے اِس فقرہ سے ہوئی۔

"طاعون ــــ ؟ ــــ کہاں ــــ ؟" میں نے متعجب ہو کر کہا۔

"قسطنطنیہ میں، اور کہاں! لیکن یہ ناممکن ہے کہ تمہیں اس کا علم نہ ہو۔ میں نے تمہیں ایک خط میں لکھا تھا۔" اُس نے کہا۔

میں مجسم حیرت بنا اُس کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میرا تمام خون سرد رگوں میں جم گیا ہے۔

"اوہو!" میرے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا اور فوراً ہی تمام واقعہ میری سمجھ میں آ گیا۔ وہ خط جو چندرا نے پڑھا تھا اور بغیر مجھے دکھائے جلا دیا تھا، عثمان کا نہیں بلکہ سرنہری کا تھا۔ اب میں سمجھا کہ اُس نے خط کو کیوں جلایا تھا۔ اس لئے کہ کہیں میں اُسے نہ پڑھ لوں۔ خط کے پڑھنے اور جلانے کے درمیانی مختصر وقفہ

میں اُس نے قطعی فیصلہ کر لیا تھا کہ میرے بجائے وہ موت کے مُنہ میں جائے گی، اور میں اس کی اس حرکت کو کسی ذاتی مفاد کی خاطر سمجھے بیٹھا تھا۔ اُس نے بجائے میرے خود مرجانا پسند کیا، اور اپنے ارادوں میں کامیاب ہوئی۔ اور میں نے اُس کو اپنے سے جُدا کر کے تباہی اور موت کے غار میں خود اپنے ہاتھوں سے دھکیل دیا۔

"خود غرض، بیوقوف، ناقدرشناس، منحوس، درندے"۔ میرا دل مجھے کوس رہا تھا۔ میرا سر چکرانے لگا اور بالکل غیر ارادی طور سے میں نے اپنا سر میز پر رکھ دیا۔ کچھ دیر کے بعد سر ہنری کا ہاتھ مجھے اپنی پیٹھ پر محسوس ہوا۔ وہ شفقت بھرے لہجے میں مجھے تسلّی دے رہا تھا۔

"لیکن سلیم! میں اِس مُعمّہ کو اب تک نہ سمجھ سکا۔ کیا تمہیں میرا خط نہیں ملا تھا؟"

میں نے انتہائی ضبط سے کام لیتے ہوئے تمام صورت حال سے انہیں آگاہ کیا "جس وقت تمہارا خط آیا تھا میں مصروف تھا۔ چندرا نے اُس خط کو پڑھا، اور پلنگ وغیرہ کا ذکر بھی نہیں کیا۔ یہی کہا کہ عثمان ہم میں سے ایک کو بُلاتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا قائم مقام فرار ہو گیا ہے...."

"فرار! ہاں میں نے تو صاف لکھ دیا تھا کہ وہ طاعون میں مبتلا ہوکر مرگیا" مسز ہنری نے کہا۔

"...... وہ مُصر تھی کہ وہ خود جائے گی۔ اور میں نے اُسے جانے دیا ۔۔۔ وہ گئی موت کے مُنہ میں مجھے بچانے کے لئے۔ آہ!"

"یقیناً اُس نے غیر معمولی قربانی کی" مسز ہنری نے اثر لیتے ہوئے کہا "قسطنطنیہ موت کا گھر بنا ہوا ہے۔ تمام رہنے والے چلے گئے اور جو نہیں گئے وہ اب مر رہے ہیں"

"مجھے کسی نہ کسی طرح وہاں پہونچنا چاہیئے" میں نے مستحکمانہ لہجہ میں کہا۔

"کیوں ؟ کیا اُس کو بچانے کے لئے ؟" مسز ہنری نے پوچھا۔

میں ہراسانی کے عالم میں اُس کی طرف دیکھ رہا تھا اور میرا دماغ غیر حاضر تھا۔

"لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ بھی طاعون کی شکار ہو جائے بہت سے آدمی بالکل تندرست ہیں" اُس نے کہا۔

"آپ اُس کی عادت سے واقف نہیں ہیں۔ وہ اتنی بے پرواہ ہے کہ دوسروں کی خدمت کرنے میں وہ اپنا بڑے سے بڑا نقصان کرنے سے بھی نہیں چوکتی ۔۔۔" میری آواز بھرّانے لگی اور فقرہ پورا

کرنے کا زبان نے یارانہ دیا۔ سرہنری کے چہرہ پر ہمدردی کے آثار نمایاں ہوئے۔

"ہاں! اس کی نیک طینت کے متعلق میں نے بہت کچھ سنا ہے، لیکن آخر تم اُس کے اس قدر گرویدہ کیوں ہو؟" سرہنری نے کُرسی سے پُشت لگاتے ہوئے کہا۔

"گرویدہ ــــ!" میں نے حیرت سے سرہنری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں صرف اُسی کے لئے زندہ ہوں۔ اِس دُنیا اور آخرت میں صرف وہی ایک ایسی ذات ہے جس کی میں پرواہ کرتا ہوں"۔ میں نے کہا۔

کچھ عرصہ تک خاموشی رہی۔ میرا دماغ اُس تک پہونچنے کی تدابیر پر غور کر رہا تھا۔ بیساختہ میرے مُنہ سے نکلا "وہ پیدل آگئی تھی۔ میں بھی جا سکتا ہوں"۔

"کون، کہاں پیدل آئی تھی ــ؟" سرہنری نے پوچھا۔

"میری چندرا ــــ! ایک ہفتہ ہوا وہ قسطنطنیہ سے یہاں پیدل آئی تھی۔ بائیس میل سے زیادہ، تیز دھوپ اور گرمی میں اُس نے اتنی بڑی مسافت طے کی"۔

"عجیب وحشیانہ حرکت تھی مجھے یقین نہیں وہ یہاں زندہ

پہونچی ہو گی آخر کیوں، یہ سُوجھی کیا تھی اُسے؟"

"محض مجھ سے ملنے کے لئے" میں نے کہا اور سر ہنری کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اُس کے برطانوی کانوں کو یہ رومانی باتیں عجیب معلوم ہو رہی تھیں۔

"محض تم سے ملنے کے لئے!!!" اُس نے استعجاب سی کہا۔

"جی ہاں!" میں نے یقین دلانے والے لہجہ میں کہا۔

"وہ کَے بجے یہاں پہونچی؟"

"رات کوئی بارہ بجے کے قریب"

"اور رات بھر تمہارے پاس رہی"

"ہاں"

"اور دوسرے دن واپس گئی؟"

"ہاں!"

اور میں نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں سے ڈھک لیا۔ مجھے اس کی مطلق پرواہ نہ تھی کہ سر ہنری میرے متعلق کیا خیال کرے گا۔ میرا دماغ تدابیر کے سوچنے میں اس درجہ غرق تھا کہ مجھے اس کی موجودگی کا بھی احساس نہ ہوا۔

ایک طویل خاموشی کے بعد سر ہنری بولا "تو اس مجنونانہ جذبہ کی

بدولت تم نے اپنی زندگی برباد کر دی، اپنی ساری غیر معمولی علمیت اور قابلیت کو آگ لگا دیا، اپنے عزیزوں سے قطع تعلق کر لیا اور اب یہاں پڑے ہوئے جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہے ہو"

عام طور سے میں لوگوں کو اپنے افعال پر تنقید کرنے کی اجازت نہیں دیتا، لیکن سر ہنری بحیثیت ایک بزرگ کے تھا اور اُس کی نیت تنقیص کے بجائے ہمدردی کرنے کی تھی اِس لئے میں خاموش رہا۔ علاوہ ازیں اخلاقیات پر بحث کرنے کا اب وقت بھی نہیں تھا۔ میں نے ایک گہرے غور کے بعد اپنا سر اُٹھایا اور اُس کی تنقیدات کا خیال کئے بغیر ملتجیانہ انداز میں کہا۔ "للہ! سر ہنری، میری کسی نہ کسی طرح مدد کرو"

میں نے دیکھا کہ سر ہنری پر میرے الفاظ نے اثر کیا۔ اُسکا چہرہ ترحم کی علامات ظاہر کر رہا تھا۔

"یہاں لانا تو اُس کا کچھ ایسا فائدہ مند ثابت نہ ہوگا۔ کیونکہ طاعون کا رُخ اسی طرف ہے!" سر ہنری بولا۔ "میں تمہارے لئے زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہوں کہ تم اُس کو تھراپیا میں میری کوٹھی پر بھیج دو۔ لیکن شاید وہ تمہارے بغیر وہاں نہ رہ سکے، اس لئے تم فوراً اُس کو قسطنطنیہ سے لیتے ہوئے تھراپیا پہونچو۔ کل صبح کی

گاڑی سے تم قسطنطنیہ روانہ ہو جاؤ اور پھر وہاں سے کل ہی یا پرسوں بخفر اپیا چلے جاؤ، وہ بہت محفوظ جگہ ہے۔ اس کے علاوہ تمہیں وہاں ہر قسم کا آرام بھی ملے گا!"

میں کسی طرح آپ کا شکریہ ادا نہیں کرسکتا اور آپ کے اس احسان سے تادمِ آخر سبکدوش نہیں ہوسکتا" میں نے لڑکھڑاتے ہوئے لہجہ میں کہا۔

سر ہنری مجھ سے اجازت لے کر سونے چلا گیا اور میں ــــ خاموش اور تاریک رات کے بھیانک سناٹے میں ایک غیر معلوم معبود کی بارگاہ میں سربسجود تھا اور میرے اعماقِ قلب سے ایک مبہم سی التجا نکل رہی تھی۔

دوسرے دن میں قسطنطنیہ میں تھا جو ایک حد تک شہر خموشاں بنا ہوا تھا۔ سڑکیں سنسان تھیں اور تمام دوکانیں بند۔ ایک ہو کا عالم تھا۔ حد یہ کہ میں اپنے پاؤں کی چاپ سے خود ڈر رہا تھا، دور دور تک آدمی کا پتہ نہ تھا۔ میں عثمان کے گھر پہونچا، اس لئے کہ وہیں سے چندرا کے متعلق معلومات حاصل ہوسکتی تھی۔ دروازہ کھٹ کھٹانے پر چندرا ہی نمودار ہوئی۔ وہ بہت نحیف و نزار تھی۔ اس کا زرد چہرہ اس کی مخصوص مسکراہٹ

سے چمک اُٹھا۔

"سلیم! تم یہاں کیسے؟"

دوڑ کر میں اُس سے لپٹ گیا اور اُس کو دوبارہ دیکھنے کی خوشی میں دیوانہ وار اس کے متبسم، مائل بہ زرد گلابی لبوں سے اپنے مشتاق اور بیدنتا کے ترسے ہوئے لب ملا دیئے۔ ـــــ کچھ دیر تک ہم اِس اتصالِ ارواح سے دوسری دُنیا میں رہے۔

"میں تم سے بھیک مانگنے آیا ہوں۔ للٰہ تم یہاں سے نکلو۔ میں آج رات کو بلکہ شام ہی کو تمہیں یہاں سے لے چلوں گا ـــــ کہو کہ ہاں میں تیار ہوں"

چندرا نے اپنا مخصوص قہقہہ لگایا۔ "یقیناً! میں تمہاری ہر آرزو کو پورا کرنے کے لئے تیار ہوں، یہی میرا مذہب و ایمان ہے ـــــ آؤ، اندر آؤ، یہاں دھوپ ہے۔" اندر جا کر میں نے گھر کو خالی پایا۔

"عثمان وغیرہ کہاں گئے؟" میں نے متحیر ہو کر پوچھا۔

"پلنگ سے ڈر کر بھاگ گئے!" چندرا نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔ اُسی لمحہ سے میں عثمان سے نفرت کرنے لگا۔

"میں سرنہری سے مل چکا ہوں اور اُن ہی سے مجھے اُس خط

کا صحیح مفہوم معلوم ہوا جس کو تم نے جلا دیا تھا۔" میں نے پُر معنی لہجہ میں کہا اور چندرا مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

"چندرا! میں جانتا ہوں تم نے میری جان بچانے کے لئے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالا لیکن میں تمہیں یہ جتا دینا چاہتا ہوں کہ تمہاری موت میری موت ہے ــــ اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ میں زندہ ہوں اُسی وقت تک جب تک کہ تم زندہ ہو ــــ یہ اٹل فیصلہ ہے ــــ سرنہری نے اس آڑے وقت پر بڑی مدد کی، اور ہم دونوں کو تھر آ پیا آنے کی دعوت دی ہے ــــ ہمیں آج ہی روانہ ہوجانا چاہیئے۔" میں نے ترغیب دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن کبھی عثمان کو تو آجانے دو۔"

"کون عثمان وہی عثمان جو اپنی جان بچا کر بھاگ نکلا۔ اور ایک پردیسی دوست کی بیوی کو جان جوکھوں میں مبتلا کر گیا۔ لعنت ہے ایسے انسان پر ــــ میں اب اُس کی شکل دیکھنے کا بھی روادار نہیں ــــ تمہارا اس وقت چلنا قطعی قرین مصلحت ہے۔ اس لئے کہ یہ میری آرزو ہے۔" میں نے اس کا شفاف اور گداز ہاتھ ــــ وہ ہاتھ جس کے قبضہ میں میری زندگی کی باگیں تھیں

ــــــ دبایا۔

اِس پر معنی لمس کا خاطر خواہ اثر ہوا، اور اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جیسی لائے ہو، میں تیار رہوں۔"

گیارہواں باب

اَبَدی نیند

سُورج غروب ہونے تک ہم نے تمام اسباب وغیرہ تیار کرلیا تھا۔ اور چندرا کی خواہش کے بموجب ہم دونوں ٹہلنے نکلے۔ ہر طرف مکمل خاموشی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہر ایک خوفناک نیند سورہا ہے۔ ہوا سرد تھی لیکن مختلف بدبوؤں سے پُر۔ ایک گھنٹے تک ہم اس ہیبت ناک فضا میں، سُنسان سڑکوں پر ٹہلتے رہے، ابھی ہم اپنے مکان سے دو فرلانگ کے فاصلہ پر تھے کہ اچانک چندرا کے چہرے پر تکان کے آثار نمودار ہوئے۔

"کیا تم تھک گئیں؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

"نہیں!" اُس نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا "میں گذشتہ تین ہفتہ سے بہت کام کررہی ہوں اور اب مجھے کسی قدر آرام کی ضرورت ہے۔"

"چند گھنٹوں کے بعد تھر آپیا کی خوشگوار ہوا تمہارے دماغ کو

تازہ کردیگی۔" میں نے کہا۔

چندرا مسکرا کر خاموش ہو رہی۔ ہم آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ اُس کا ایک ہاتھ میرے شانے پر تھا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ اس سے غیر معمولی سہارا لے رہی ہے۔ جیوں جیوں ہم آگے بڑھتے گئے چندرا کی حالت خراب ہوتی گئی۔ میں اس کے چہرے کا بغور مطالعہ کر رہا تھا ۔۔۔۔ ایک دم سے وہ لڑکھڑائی۔ میں نے اُسے سنبھالا۔ دوسرے لمحے وہ بیہوش تھی!!! میں سر د پسینہ میں نہا رہا تھا اور میرا دماغ خوف اور ہراسانی کی وجہ سے کام نہ کرتا تھا۔ میں نے اُسے گود میں اُٹھایا اور دیوانہ وار گھر کی طرف چلا۔ میرے احساسات منجمد تھے۔

تین ہفتے تک وہ سخت قسم کے طاعون میں کام کرتی رہی۔ اور محفوظ رہی ۔۔۔ لیکن مقدر نے اُس وقت جب کہ وہ سلامتی کی طرف جانے والی تھی، آن گھیرا ۔۔۔ جیسے ہی کہ میں نے گھر کے دروازہ پر قدم رکھا اُس کو کچھ ہوش سا آیا۔

"یقیناً پلیگ ہے۔ سلیم! قسمت کا لکھا پورا ہوا۔ لیکن تم ہراساں نہ ہو، بیس فی صدی انسان بچ جاتے ہیں۔ شاید میں اُن میں سے ایک ہوں۔" اور اُس نے پلنگ پر دراز ہوتے ہوئے

اِس کمزوری کے عالم میں بھی اپنا وہ مخصوص نقرئی قہقہہ لگایا جس کو سُنتے ہی انسان اپنا رنج وغم بھول جاتا ہے۔ میں خاموش تھا اور میرے چہرے کی زردی ہی مجسّم جواب تھی۔

"آقاجی کو بُلاؤ!" اُس نے بمشکل کہا اور اُس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔

میں فوراً آقاجی (نوکر) کے پاس گیا اور اُس کو سول سرجن کے پاس دوڑایا۔ واپسی پر میں نے چندرا کو استفراغ میں مُبتلا پایا۔ اُس کا تمام جسم کانپ رہا تھا اور چہرے پر مُردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ لپک کر میں نے سلپچی اُس کے آگے رکھدی اور اس کا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"سلیم! خدا کے واسطے مجھ سے دُور رہو" اُس نے دبی زبان سے ملتجیانہ لہجہ میں کہا۔

"ہرگز نہیں، چندرا! تم میرا فکر نہ کرو" میں نے جلدی سے کہا اور استفراغ ختم ہونے پر اُس کو پلنگ پر لِٹا دیا۔ اُس کا جسم نڈھال ہوتا گیا اور چہرے کی زردی بڑھتی گئی۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے۔ نبضوں میں خفیف سی جُنبش تھی اور چہرے پر انتہائی کرب کے آثار قائم ہو چکے تھے لیکن اُس نے دلجمعی سے کہا۔

"میرے ہینڈ بیگ میں کچھ افیون کی گولیاں ہیں، ذرا وہ نکال دو۔ اُن سے بہتر ایسے وقت میں کوئی دوسری چیز نہیں۔"

میں نے جلدی جلدی اُس کا ہینڈ بیگ کھولا اور اُس میں سے افیون کی ایک گولی نکال کر اُس کو کھلائی۔ وہ بمشکل ایک خفیف سا تبسّم پیدا کر سکی اور پھر ڈھیر ہو کر پڑ گئی۔ اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور میں اُس کے چہرے کی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھا رہا۔

بیس منٹ گذر گئے اور چندرا کی حالت میں کوئی تغیر نمودار نہیں ہوا۔ وہ اُسی طرح بے ہوشی کے عالم میں لوتھ ہوئی پڑی تھی۔ اور میں انتہائی پریشانی میں اس کے قریب بیٹھا تھا۔ کبھی نبض دیکھتا اور کبھی دل کی حرکت کو محسوس کرتا۔ اچانک دروازہ کھلا اور آقا حیٔ ایک موٹے سے ترکستانی ڈاکٹر کی معیت میں داخل ہوا۔ دوڑ کر میں ڈاکٹر سے لپٹ گیا۔ اتنے اوسان نہ تھے کہ اُس کو مفصل کیفیت سے آگاہ کرتا۔ بس یہی کہہ سکا۔ "خدا کے واسطے ڈاکٹر صاحب! اسے جلدی سے اچھا کیجئے۔" اگر میرے پاس کچھ بھی ہوتا تو میں اُسی وقت ڈاکٹر صاحب کی نذر کر دیتا۔ ڈاکٹر صاحب نے پیشہ ورانہ انداز میں میری تسلّی کی اور مریضہ کا

معائنہ کرنے لگا۔

چندرا نے آنکھیں کھولیں اور پھر اُس کو استفراغ کے دورے پڑنے شروع ہوتے۔ اتنی شدید تکلیف تھی کہ اُس کی جان نکلتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ استفراغ کے ہر حملے کے بعد وہ پہلے سے زیادہ کمزور ہوتی جاتی تھی اور میرا دل ڈوبا جاتا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور اُس میں سے کچھ دوا نکال کر مجھے دی۔ میں نے زبردستی اُس کو چندرا کے حلق سے اُتارا لیکن دو منٹ بعد ہی وہ ویسی کی ویسی نکل گئی۔ اُس نے دوسری خوراک دی جس میں اُس نے معمول سے زیادہ کاربالک ایسڈ شامل کیا۔ وہ ہضم ہو گئی۔ اور چندرا پر پھر بیہوشی طاری ہونے لگی۔

ہر پندرہ منٹ کے بعد ڈاکٹر اُسے ایک خوراک پلاتا تھا لیکن استفراغ جاری رہا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اس دوا سے کچھ فائدہ نہیں "ڈاکٹر صاحب! للٰہ کوئی اور تدبیر کیجئے۔" میں نے چلا کر کہا۔ چندرا میری آواز سے ہوشیار ہوئی اور اپنا جھلستا ہوا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے بڑی کوشش سے اتنا کہا۔ "ڈاکٹر صاحب کا کوئی قصور نہیں ہے تسلیم! یہ کمبخت مرض ہی ایسا ہے۔" اور اُس کے چہرے پر ایک اُداس اور مرجھائی ہوئی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

دو گھنٹے تک میں اور ڈاکٹر اُس کے قریب کھڑے رہے۔ اس کے بعد صبح پھر آنے کے وعدے پر ڈاکٹر صاحب رُخصت ہو گئے۔ میں نے چندرا کی نبض دیکھی۔ بہت خفیف سی جُنبش تھی، اُس کا سارا جسم سرد پسینہ میں نہا رہا تھا۔ چندرا نے پانی مانگا اور میں نے بغیر کچھ سوچے سمجھے اُس کو تھوڑی سی برانڈی پلادی۔ اِس سے قدرے سکون ہوا۔ میں نے اُس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ اُس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور اپنے خشک کانپتے ہوئے لبوں کو متبسم کیا۔ "اگر تم ایک "ہائپو ڈرمک انجکشن کر سکتے"....... اور وہ فقرہ پورا نہ کر سکی، میں نے آج تک کبھی انجکشن نہیں لگایا تھا۔ لیکن اُس کو بارہا لگاتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ بھی میں جانتا تھا کہ انجکشن کا سامان اُس کے ہینڈ بیگ میں ہے۔ بے چارگی نے مجھے ہمّت دلائی اور میں نے جیوں تیوں اُس کے سرد بازو میں انجکشن لگا ہی دیا۔ اُس کے بعد سے اُس کی تکلیف میں کمی ہونی شروع ہوئی۔ شکر خدا کا آہستہ آہستہ اُس کے چہرے پر خفیف سی تازگی نمودار ہونی شروع ہوئی۔ ایک سکون سا ہو گیا اور وہ سو گئی۔

میرے دماغ کو سوچنے کا موقع مِلا۔ اگر وہ مجھ سے چھین لی گئی تو پھر دُنیا میں میرے واسطے کیا رکھا ہے نہیں! ہرگز نہیں! میں

اُس کے بغیر اور اُس کے بعد زندہ نہیں رہ سکتا۔ ایک غضبناک جذبۂ بغاوت مجھ پر طاری ہوا۔ فطرت کے ساتھ بغاوت۔ اور میں نے تہیّہ کرلیا!

میری نظروں کے سامنے اُس کا ملکوتی پیکر موت کا شکار ہوا جارہا تھا ــــــ اور میں بے بس تھا، کوئی طاقت، کوئی قوت مجھے اُس کے ساتھ مرنے سے نہیں روک سکتی تھی۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ وہ زندہ رہے اور میں بھی اُس کے ساتھ زندہ رہوں، کاش ایسا ہوتا!۔

رات بھر میں بُت بنا اُس کے سرہانے بیٹھا رہا۔ اُس پر بیہوشی کا سا عالم طاری رہا۔ نہ سکون تھا اور نہ بے چینی، ایک سی حالت تھی۔ لیکن صبح ہوتے ہی اُس کی طبیعت خراب ہونی شروع ہوئی۔ پے در پے استفراغ اور غشی کے دورے پڑتے تھے جیسے ہی کہ سورج کی اوّلین کرن نے کمرے کو روشن کیا، میں نے چندرا کی طرف دیکھا اور مجھے یقین ہو گیا کہ انجام قریب ہے۔ وہ موت کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اُس کے ہاتھ پاؤں سرد تھے اور ساکن۔ سڈول گدرایا ہوا حسین جسم، نعش کی مانند بے حس تھا۔ دل نشین چہرہ جو کل تک جوانی کے رنگ و روغن سے مرصّع اور روشن تھا، اُس

وقت زرد اور مرجھایا ہوا تھا۔ اس کی طرف دیکھنے سے ڈر لگتا تھا۔

میں نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیا۔

ڈاکٹر نے آتے ہی ٹمپریچر لیا جو بالکل نہ ہونے کے برابر تھا۔ میں نے اس سے رائے لیکر چندرا کو زبردستی ایک گلاس برانڈی کا پلایا۔ سوائے اس کے اور کوئی علاج نہ تھا۔ ہر آدھ گھنٹے کے بعد میں اُسے برانڈی اور شیمپین پلاتا رہا۔ لیکن بے سود! چندرا کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی اور بالآخر اس پر نزاع کی کیفیت طاری ہونی شروع ہوئی۔

میں نے ڈاکٹر کی طرف پُرمعنی نظروں سے دیکھا اور وہ ہم کو تنہا چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا مگر کوئی کارآمد چیز نظر نہ آئی۔ ڈاکٹر کا بیگ وہیں رکھا تھا۔ جلدی سے اُسے کھول کر میں نے اُس میں سے ایک تیز چاقو نکال لیا۔

"سلیم!" وہ آواز جو پہلے اتنی شیرینی اور سُریلے پن کے اعتبار سے لاثانی تھی، اب ایسی نحیف، کمزور اور غیر دلکش تھی کہ بالکل موت کی سی آواز معلوم ہوتی تھی۔ فوراً ہی میں اُس کے سرہانے تھا۔

"سلیم! عزیز ترین سلیم! خدا حافظ ——— !!!"

میں ساکت تھا، دیوانہ وار میں اُس کے قریب لیٹ گیا۔ اُس کا

جسم سرد تھا۔ کاش میرا تڑپتا ہوا دل اور اُلفت کے بڑھتے ہوئے شعلے اُس کے سرد جسم میں حدّت پہونچا سکتے۔ میں نے اپنا ایک بازو اُس کے سر کے نیچے رکھ دیا اور اُس کے سرد، نیلے (جو اب بھی اُسی طرح حسین معلوم ہوتے تھے) ہونٹوں کو چوما۔ اُس نے آنکھیں کھولیں اور میرے دوسرے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر اپنا کمزور، نحیف ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی مگر ناکامیاب رہی۔

"سلیم! خدا کے لئے اپنے آپ کو برباد نہ کرو" اُس نے بمشکل کہا۔

"تم جا رہی ہو، اور میں تمہارے ساتھ آ رہا ہوں" میں نے کہا۔

"زندہ رہو اور مُقدر کے تحائف کو قبول کرنا سیکھو۔۔۔ میں یقیناً تمہارے ساتھ زندہ رہتی، مگر میں۔۔۔ میں۔۔۔ مجبور ہوں" اُس نے شکستہ لہجے میں کہا۔۔۔ "تم خوب جانتے ہو میں تم سے محبت کرتی ہوں۔۔۔ میری۔۔۔ رُوح محبت کرتی ہے!" اور اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ سیاہ مدبھری آنکھیں جن کی گہرائیوں میں میں اب، اس وقت بھی محبت کے اُبلتے ہوئے چشمے دیکھ رہا تھا۔

"میں جانتا ہوں، جانتا ہوں!" میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا،

گرم گرم آنسو میرے چہرے پر سے ہوتے ہوئے اُس کی زرد اور صاف پیشانی پر گر رہے تھے۔" اور دُنیا میں ہمارا عشق ضرب المثل ہو کر رہیگا۔ چندرا کیا تم مجھے معاف نہ کرو گی ــــــ ؟ شاید مجھ سے کوئی قصور ہوا ہو۔"

"بالکل نہیں، سلیم! ہم دونوں کو ایک دوسرے سے عشق رہا۔ بھلا قصور اور معافی بھی ــــــ خدا ــــــ!" اور اُس کی آواز بند ہو گئی۔

"تمہارے ساتھ زندہ رہنا ایک مستقل عیش تھا اور تمہارے ساتھ مرجانا اُس سے زیادہ موجبِ انبساط" میں نے کہا۔ "پلیٹو کہتا ہے۔ محبت کے بندے اس دُنیا میں بھی ایک مسرور زندگی بسر کرتے ہیں اور جب جاتے ہیں تو دونوں ساتھ ساتھ اُڑتے ہوئے اور وہاں ازلی گلشن میں بھی معصوم پرندوں کی طرح خاموش رہتے ہیں۔"

چندرا نے آخری مرتبہ اپنی آنکھیں کھولیں، اُن کی چمکدار مسکراہٹ ابھی تک برقرار تھی۔ ایک خفیف سے دہشت آمیز تبسم کے بعد اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے چاقو اپنے گلے کے قریب رکھ لیا اور منتظر رہا، چند منٹ تک جو دُنیا میں ہمارے آخری

منٹ تھے۔

چندرا کو پہلی ہچکی آئی۔ رُوح نے جسم سے آزادی حاصل کرنی شروع کی۔ میں نے اُس کے خشک جسم کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ دوسرا حملہ ہوا اور اُس کا ہر وہ عضو جس کی میں پرستش کرتا تھا کانپنے لگا اور بالآخر اکڑ کر سخت ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ تیسری ہچکی آخری ہوگی۔ جیسے ہی کہ حملہ شروع ہوا، میں نے آگے کو جُھک کر پوری طاقت سے تیز چاقو اپنے گلے پر پھیر دیا۔۔۔ گوشت کٹتا ہوا مجھے محسوس ہوا۔ خون کا ایک دریا بہہ بہہ کر اُس کے سینہ اور گردن پر پڑنے لگا اور میں لیٹ گیا۔۔۔ اُس کے خشک نیلے لبوں پر اپنے کانپتے ہوئے لب رکھ کر۔۔۔ آہ! شیریں لمحہ!۔ اُس کے آخری سانس یا شاید رُوح کو میں اپنے اندر جذب کر لینا چاہتا تھا۔۔۔!!
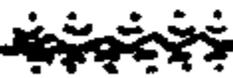
بارھواں باب

دِل کی موت

ایک طویل اور تکلیف دہ بیہوشی کے بعد سب سے پہلا واقعہ جو پیش آیا وہ یہ تھا کہ میں نے اپنے آپ کو ایک ایسے کمرے میں پایا جس میں میں پہلے کبھی رہ چکا تھا۔ میں ایک مسہری پر چت لیٹا تھا، اور میرے ہر عضوِ بدن میں ایک خاص قسم کا درد تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں جکڑے ہوئے ہیں۔ میری گردن پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور میں سر کو جنبش نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے چاہا کہ میں بولوں لیکن میں قاصر رہا۔ کیوں؟ — مجھے کسی بات کا علم نہیں تھا۔ سوائے ایک خوفناک حقیقت کے کہ میں اب تک زندہ تھا۔ ایسے انسان سے زیادہ منحوس اور کون ہو سکتا ہے جو خود اپنا گلا بھی نہ کاٹ سکتا ہو۔

چندرا کہاں تھی؟ اُس کی رُوح دلکش فضا میں خدا معلوم کہاں کہاں کی سیریں کرتی پھر رہی ہوگی لیکن میری رُوح ابھی تک

مقیدّ تھی۔

کاش میں اِن جکڑبندشوں سے آزادی حاصل کرکے اپنے آپ کو مار سکتا۔ اور اپنی رُوح کو بھی چندرا کی رُوح سے ملا دیتا۔ لیکن ـــــ میرا تمام جسم بُری طرح جکڑا ہوا تھا۔ میں نے کمرے کے چاروں طرف نظر کی اور ایک پہچانی ہوئی شکل مجھے نظر آئی۔ میرے والد کھڑے کسی چیز کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ وہ چیز کیا تھی؟ چندرا کی ایک تصویر، جس میں وہ ایک معمولی نرس کا لباس پہنے کھڑی تھی۔ والد صاحب تصویر کو دیکھ کر کچھ بڑبڑائے۔ لیکن اتنا کرم ضرور کیا کہ اُسے پھاڑا نہیں۔ اس مشاہدے کے بعد وہ میری طرف آئے اور یہ دیکھ کر کہ میری آنکھیں کھُلی ہوئی ہیں، دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئے۔

"سلیم! ـــــ بیٹا سلیم! کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟" اُنہوں نے انتہائی محبّت آمیز لہجہ میں کہا۔

میں نے سر کے اشارے سے اثبات میں جواب دیا۔

"تم اگر وعدہ کرلو کہ کوئی بیوقوفی کی حرکت نہ کروگے تو میں تمہیں اسی لمحے آزاد کردوں۔"

میں نے اس جواب دینا فضول سمجھا۔ والد صاحب ایک مُستقل

نکچر دینے پر تلے ہوئے تھے۔

"سلیم! ذرا غور کرو۔" اُنہوں نے کہا۔ "یہ تمہاری انتہائی بیوقوفی ہو گی۔ تم ایک عرصہ تک پلیگ اور شدید قسم کے دماغی بخار میں مبتلا رہے۔ تمہارے گلے میں بہت مشکل سے ٹانکے لگائے جا سکے۔ سر ہنری نے انتہائی ہمدردی اور نیک دلی کا ثبوت دیا۔ اُنہوں نے مجھے بذریعہ تار مطلع کیا اور میں زرِکثیر خرچ کر کے بو اپسی یہاں (ترکستان) پہنچا، ہزاروں صعوبتیں برداشت کر کے تمہارا علاج کیا اور اب تم خدا کے فضل سے اچھے ہو۔ کیا تم ہماری ساری تکالیف کا بدلہ محسن کشی سے دینا چاہتے ہو۔ یہ محض اتفاق ہے کہ تمہاری جان بچ گئی، اور ڈاکٹر نے تو واقعی تمہیں پہلے پہل مُردہ سمجھا تھا۔ اگر جا قو ایک سر مو بھی اور آگے بڑھ جاتا تو یقینی موت تھی۔ لیکن ڈاکٹر نے بڑی ہوشیاری اور محنت سے کام کیا۔ سر ہنری نے بھی حتی المقدور کوشش کی، میں بھی ہندوستان سے یہاں چلا آیا، اور عثمان نے بھی ہمارے طعام قیام کا انتظام کرنے کے علاوہ تمہارے علاج میں بہت کچھ ہاتھ بٹایا۔ ہم سب کا مقصد یہی تھا کہ کسی نہ کسی طرح تمہاری جان بچا لیں، اور اب تم اس جان کو برباد کرنے پر

تُلے ہوئے ہو۔ ذرا غور کرو یہ بالکل بچوں کی سی ہٹ ہے یا نہیں۔
کیوں تم ہمارے سارے کئے دھرے پر پانی پھیرے دیتے ہو۔
ابھی تک حالات تمہارے موافق ہیں۔ میں تمہیں اپنے ساتھ
ہندوستان لے جاؤں گا۔ اور تم اب بھی بآسانی سول سروس
میں داخل ہو سکتے ہو۔ اپنی جوانی کا خیال کرو۔ اپنی غیر معمولی قابلیت
پر غور کرو —— تمہارا مستقبل کتنا درخشاں ہے۔ اس کے علاوہ
چندرا اب گذر چکی ہے اور تمہارا کسی کام کا کرنا یا نہ کرنا اُس پر
مطلق اثر نہیں رکھتا —— سلیم! ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو۔
تم میرے اکلوتے بیٹے ہو اِس ضعیفی میں مجھے صرف تمہارا ہی
سہارا ہے، میری اور اور سب کی تمام اُمیدیں تمہاری ذات
سے وابستہ ہیں۔ خاندان کا نام و ناموس تمہارے ہی ہاتھ ہے۔
لِللہ! سلیم! بچّوں کی سی ضد نہ کرو۔ تم زندہ رہو میری خاطر
سے —— خدا جانتا ہے اگر تم نے اپنی جان دیدی تو میں بھی
اِس دُنیا میں زندہ نہ رہوں گا —— وعدہ کرو سلیم! کہ تم مجھ
بُڈھے کی خاطر زندہ رہو گے .....،،

اتنا کہہ کر والد مجھ سے لپٹ گئے اور زار و قطار رونے لگے۔
میری بھی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ میرے والد

پر قبل از وقت بڑھاپا چھا گیا تھا۔ مجھے اُس وقت اُن پر رحم سا آ رہا تھا۔ اور آہ! میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر کہہ ہی دیا "یقیناً۔ آپ کی خاطر میں زندہ رہوں گا۔"

جوشِ مسرت سے والد ڈاڑھیں مار کر رونے لگے اور دیوانہ وار مجھے تمام جکڑبندشوں سمیت گلے لگا لیا — میرے ہاتھ پاؤں کھول دئے گئے۔ میں نے اپنے جوڑ جوڑ میں درد محسوس کیا، ڈاکٹر نے مجھے کچھ برانڈی پلا ہی دی جس سے مجھ میں کافی توانائی آ گئی۔ ایک چھڑی کے سہارے میں کھڑا ہوا اور اپنی میز کے قریب گیا۔ سب سے پہلے جس چیز پر نظر پڑی وہ چندرا کی وہی تصویر تھی جو والد صاحب کے ہاتھوں چاک ہوتے ہوتے رہ گئی۔ چہرے پر وہی دل نشین مٹھاس تھی آنکھوں میں وہی رس تھا اور ہونٹوں پر وہی سحر آفریں تبسم — ایک از خود رفتگی کے عالم میں میرے مُنہ سے ایک چیخ نکل گئی اور میں بیہوش ہو کر فرش پر گر پڑا۔

× × × × × × × × × × × × × × ×

اِس واقعہ کو کئی برس گذر گئے اور اب میں ہندوستان میں ہوں۔ اور سول سروس کا ایک کامیاب ترین ممبر

سب لوگ مجھے انتہائی خوش قسمت سمجھتے ہیں۔ لیکن شاید آج تک کسی نے مجھے مسکراتے ہوئے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔

بظاہر میں زندہ ہوں لیکن میرا دل چندرا کے ساتھ مر چکا ہے۔

قسطنطنیہ کی ایک خانقاہ میں سنگِ مرمر کا ایک خوشنما "مسولیم" بنا ہوا ہے جس کی پیشانی پر سنگِ موسیٰ میں جلی قلم سے یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:۔

"بیادگارِ شہیدانِ اُلفت"

"چندرا موہنی ———— محمد سلیم"

اگرچہ میں اب تک زندہ ہوں لیکن میری حقیقی زندگی وہی تھی جو چندرا کے ساتھ بسر ہوئی، میرا جسم زندہ ہے لیکن میری رُوح چندرا کی روح کے ساتھ ہے۔

میرا کمرہ جس میں کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہے، ہر قسم کے سامان سے خالی ہے۔ لیکن سامنے کے رُخ قدِ آدم سائز میں چندرا کی ایک تصویر جس کی میں شب و روز پرستش کیا کرتا ہوں آویزاں ہے۔ اس کے علاوہ تابدان پر چندرا موہنی کا ایک مرمریں مجسمہ رکھا ہوا ہے جو ہر وقت میرے پیشِ نظر رہتا ہے۔

عہدِ گذشتہ کے تمام وجد آفریں واقعات میرے دل پہ خونیں حرفوں میں نقش ہیں۔ جن کو میں اکثر ایک نہ بھولنے والے سبق کی طرح دُھرایا کرتا ہوں، بظاہر مجھے ہر طرح کا عیش و آرام حاصل ہے لیکن میرا دل مُردہ ہے اور میں بے چینی کے ساتھ منتظر ہوں اس لمحہ کے لئے جب کہ میری رُوح قیدِ جسم سے آزاد ہو کر چندرا کی رُوح سے معانقہ حاصل کرے ۔

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ختم شُد

※

(کتبہ انوار ۲۱ اگست ۴۳ء)